allurdupdfnovels.blogspot.com

زرخیز پتھر

سفرنامہ

شش فرخ

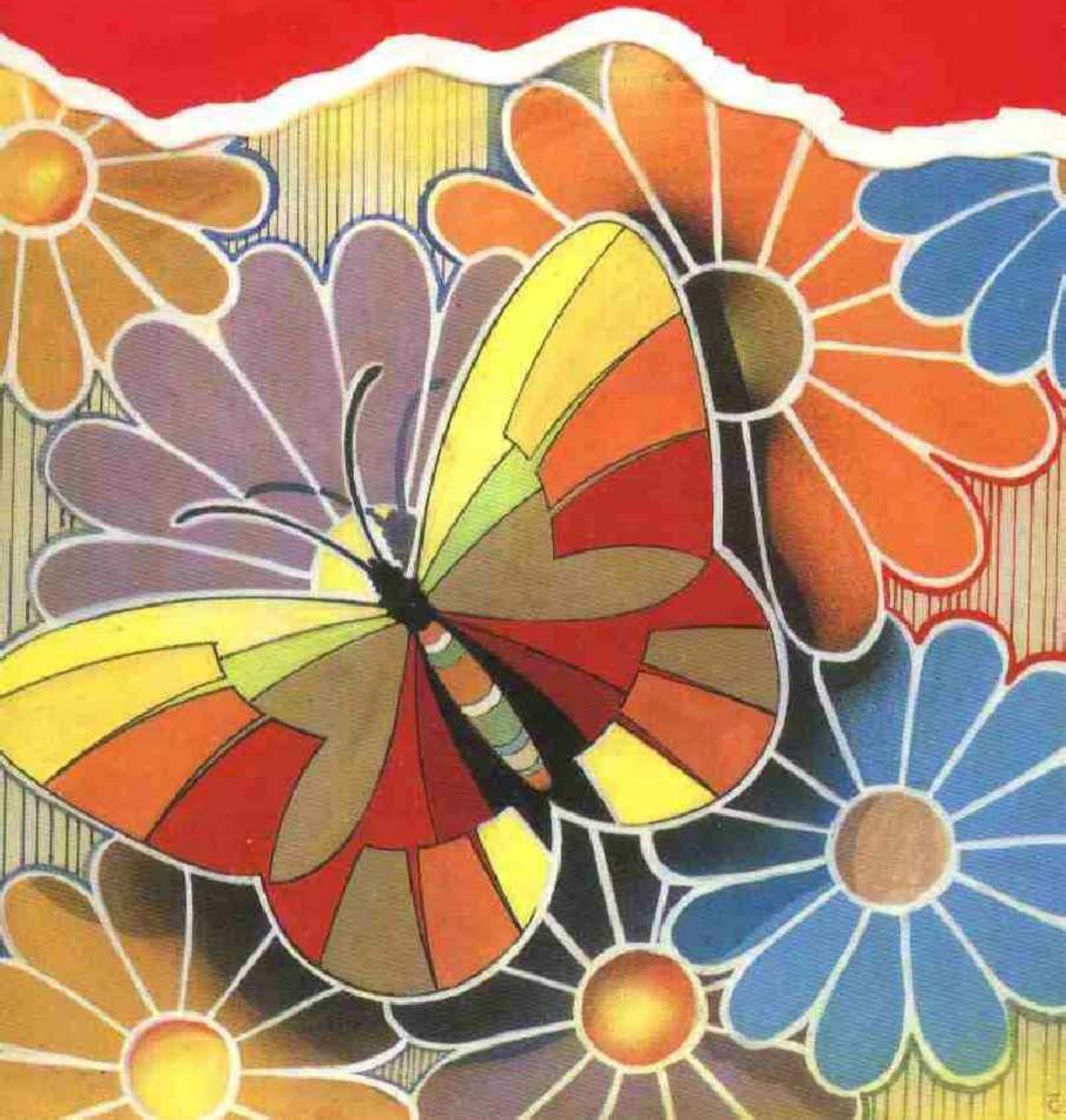

allurdupdfnovels.blogspot.com

گورنمنٹ کالج فار ویمن لائل پور۔ بی اے کی طالبہ۔

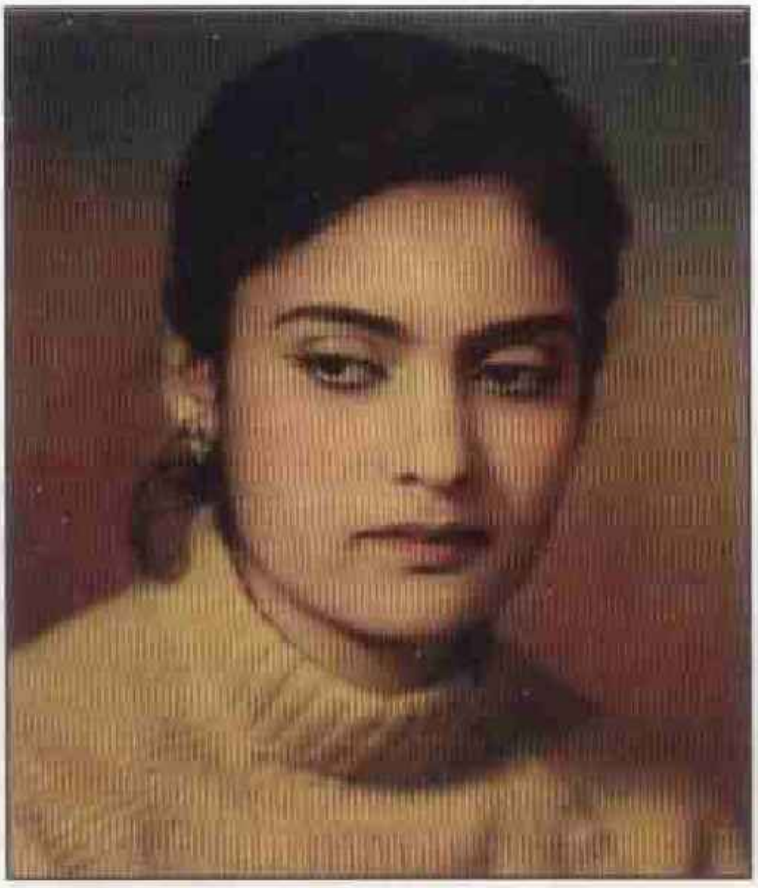

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پوسٹ گریجویشن کے بعد 1959ء۔

allurdundfnovels.blogspot.com
sheen farrukh

کراچی۔1962ء

اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ۔1963ء

allurdupdfnovels.blogspot.com

sheen farrukh

Taken from from her recently published autobiography JEENAY KA JURM (2013)

سلیم شاہد کے ساتھ انٹرویو۔ بی بی سی لندن ٹیلی ویژن۔ 1975ء

allurdupdfnovels.blogspot.com

۱۹۹۶

نیاز احمد نے
ناصر بشیر پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔
تعداد ـــــ ایک ہزار
قیمت ـــ/۷۵ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0569 - 7

"مجھے کسی ہوٹل میں ایک کمرہ چاہئے"

"سنگل؟"

"جی بالکل، سنگل۔"

اس نے بمبئی ایئرپورٹ کے ہوٹل انفارمیشن کاؤنٹر پر بمبئی کے ہوٹلوں کے نام اور نرخوں کی فہرست میرے سامنے رکھ دی۔

"ٹھیک ہے۔ یہ چلے گا" میں نے ایک ہوٹل پر نشان لگایا

میں ابھی فون کر کے معلوم کر لیتا ہوں۔ لیکن

لیکن کیا؟

سریش، ہاں اس کا نام سریش ہی تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔

جنوری کا مہینہ صبح کے تین بجے تھے

"میرا مشورہ ہے کہ آپ اس وقت شہر نہ جائیں ٹیکسی والا آپ سے تین ساڑھے تین سو روپے لے لے گا پھر اس وقت ـــــ!

وہ یہی کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت اکیلی عورت کا ٹیکسی میں ایئرپورٹ سے شہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔ نہیں اسے میرے اکیلے پن پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک امریکی ٹورسٹ عورت بھی کچھ اس قسم کا مسئلہ لئے کھڑی تھی۔ یہ لوگ، رسی تڑوا، کر نکل کھڑی ہونے والی عورتوں کے عادی ہیں۔

آپ کچھ دیر انتظار کریں۔ دو تین گھنٹوں میں سویرا ہو جائے گا۔ پھر چلی جائیے گا۔

میں دل ہی دل میں تلملا رہی تھی۔ لو بھلا میں تین گھنٹے تک کیا کروں گی۔ تمہارا مطلب ہے کہ وہ سامنے جو کاؤچ پڑا ہے اس پر بیٹھ کر تمہاری صورت دیکھتی

allurdupdfnovels.blogspot.com

رہوں۔ نہیں بابا نہیں۔ ہمیں تو ویسے بھی بہت عرصے سے چین نہیں ملا۔ جدھر دیکھو سنتری ڈنڈا گھماتے پھرتے رہتے ہیں۔ کوئی سکھ کا سانس لینا چاہے تو وہ فوراً ٹھوکر لگا کر "خبردار خبردار" کی صدا لگا دیتے ہیں۔

دیکھو۔!!

وہ دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ کاؤنٹر پر کھڑا سامنے رکھی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ میرے فیصلے کے انتظار میں تھا کہ آیا میں اس وقت بمبئی جانا چاہتی ہوں یا یہاں رکنا چاہتی ہوں یا---

"ہاں ایک طریقہ ہے"

اوہو' اب یہ کیا کہنے لگا ہے یہی کہ میرے گھر چلو' ـــــ اگر میں پندرہ بیس سال پہلے یہاں آئی ہوتی تو شاید وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر مجھے اپنے گھر لے ہی چلتا۔

ہاں تو کیا!!

وہ یہ کہ آپ جوہو کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔ اس ہوٹل کی ٹرانسپورٹ موجود ہے۔ آپ کو کوئی کرایہ نہیں دینا ہو گا اور یہ محفوظ بھی ہو گی۔

"گریٹ' ٹھیک ہے"

صبح کے 3 بجے کس کم بخت کو یاد تھا کہ جوہو کے ہوٹلوں کے بارے میں کرشن چندر کیا کچھ کہتا رہا تھا اس نے کیا کیا دیکھا تھا

سریش نے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ کر اشارہ کیا اور اس کے اشارے پر ناچتی ہوئی ایک سوزوکی وین کھٹ سے میرے سامنے آ کر رک گئی اور اگلے لمحے وہ خالی خالی سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی

خدا جانے یہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

ہوٹل چیک ان' کمرے میں آمد' بتیاں جلیں بتیاں بجھیں ایئرکنڈیشنر کی گھرر گھرر پنکھے کا بند ہونا۔ پھر چلنا یہ سب کچھ مجھے اگلی صبح ایک ایک کر کے یاد آتا رہا۔ ایک بات اور بھی۔

میں جونہی جہاز سے باہر آئی تھی تو مجھے اپنی طرف بڑھتا ہوا ایک سایہ سا نظر آیا تھا۔ وہ قریب آیا۔ میرا نام لیا ـــــ حیرت

"جی میں ہی ہوں۔ فرمایئے"

"آپ بابر ایاز کو اس نمبر پر فون کر لیں"

اوہ' بہت بہت شکریہ۔"

مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میں نے ایئرپورٹ سے بابر کو فون کر کے اسے سوتے میں جگایا تھا اور یہ خبر دی تھی کہ ایئرلائین والوں نے میرا سامان گم کر دیا ہے۔ اور مجھے کسی معقول ہوٹل میں کمرہ نہیں مل رہا۔ اچھا سو جاؤ۔ میں صبح فون کروں گی۔

بابر ایاز اور صبیح الدین (ایڈووکیٹ) ایک روز پہلے یہاں پہنچے تھے۔ بابر بھی ایک صحافی ہے۔ اس سے بھی اتنی شناسائی تھی کہ میں پریس کلب میں چائے پی رہی ہوں۔ بابر قریب سے گذرا۔ ہاں ارے کیا حال ہے۔ بہت دن بعد نظر آئے ہو۔ کچھ اسی قسم کے میرے جواب سُن کر وہ آگے نکل گیا۔ لیکن اس روز یہ لگا کہ بابر سے زیادہ کوئی مونس و غمگسار بھلا اس دنیا میں کون ہو گا۔

میں ابھی آدھی سو رہی تھی۔ یہ سوچ رہی تھی کہ چائے منگوائی جائے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"ارے۔ تم"

سریش کھڑا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میری ڈیوٹی ختم ہوئی تو سوچا دیکھتا چلوں کہ آپ بخیریت پہنچ گئی تھیں۔ کیا ٹھیک سے سوئیں۔

بہت بہت شکریہ" ـــــ یہ کتنا خیال کرنے والا ڈیوٹی افسر ہے۔ پہلے مسافروں کو کمرے دلاتا ہے پھر ان کے کمرے میں جا کر ان کا حال چال پوچھتا ہے لیکن ـــــ کرشن چندر' منٹو' کا مشاہدہ غلط نہ تھا۔ جو ہو ـــــ کتنا بھلا سا نام ہے۔ یہ نام کیسے بگڑ گیا۔

"آپ یہاں کتنے روز ٹھہریں گی؟"

کچھ معلوم نہیں۔ ـــــ"

"آج کا کیا پروگرام ہے؟"

اس کی بھی کچھ خبر نہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

میرے روکھے سے جواب نے میرے مہربان کو بہت بد مزہ کیا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔"

"جی" اور وہ چلا گیا۔

یہ میری پرانی اور نقصان دہ عادت ہے۔

مجھے اس پرچی کی تلاش تھی جو مجھے اس پراسرار شخص نے دی تھی —— جس پر بابر کے ہوٹل کا نام اور فون نمبر درج تھا۔ مل گئی۔ شکر۔

بابر نے فون اٹھایا —— اور وہ چلایا۔ یار تم کہاں چلی گئی تھیں۔ ہم دونوں صبح سے اس فکر میں تھے کہ تمہارا کیا بنا۔

دیکھو' میں صحیح سلامت ہوں۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہے"

تم فوراً شہر پہنچو۔ پھر مل کر کچھ سوچتے ہیں۔

"ہاں ٹھیک ہے" رہائش کا بھی کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔

میں بس' ریل' ٹیکسی بدل بدل کر ان کا ہوٹل ڈھونڈتی ہوئی پہنچ گئی۔ ایک شاندار ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل' استقبالیہ پر اسمارٹ اور خوبصورت لڑکیاں۔

میں حیرت زدہ تھی

یہ بابر یہاں آکر اتنے ٹھاٹ باٹ والا کیسے ہو گیا اس نے بتایا تھا کہ وہ بھی اپنے ہی پیسوں سے چھٹی گذارنے آیا ہے۔ لیکن یہ ہوٹل —— کوئی صحافی سرکاری دورے پر آئے ہوئے سربراہ مملکت کے ساتھ آئے تو وہ اس سے بھی اونچے ہوٹل میں ٹھہرتا ہے۔ لیکن اپنے پیسوں سے ---- نہیں۔!!

بابر کہہ رہا تھا۔ کل ہم بہت خوار ہوئے۔ پورے بمبئی میں کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ ٹورسٹ سیزن ہے آج پھر کوشش کر دیکھتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک ہندو دوست کو فون کیا ہے۔ وہ یہاں کا ایک بڑا بزنس مین ہے۔ چیمبرز آف کامرس کا پریذیڈنٹ ہے۔ وہ اپنی گاڑی بھیج دے گا۔

تو تم اپنی اکنامک بیٹ کا استعمال یہاں بھی کرنے لگے۔

دنیا بھر کے صحافی اپنی اپنی بیٹ کے مطابق درجہ بدرجہ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ کرائم رپورٹر' پولیٹیکل رپورٹر' کامرس رپورٹر' —— چاہیں تو خوشحال زندگی

گذار سکتے ہیں۔ دیکھو اپنی برادری کی بات ہے میں اس ضمن میں مزید کھل کر بات نہیں کر سکتی۔

بابر مجھے فخر سے بتانے لگا۔ "پتہ کیا۔ بمبئی کے چیمبرز آف کامرس نے میرے اعزاز میں استقبالیہ دینے کا پروگرام بنایا ہے۔"

نئے منہ بابر' تم یہ چھٹی گذارنے آئے ہو کیا۔ ایسے سیٹھوں کی کراچی میں کمی نہ تھی جو تمہارے اخبار میں اپنی خبر چھپوانے کی خاطر تمہارے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔

بہر حال بابر کی اکنامک بیٹ کی بدولت بمبئی کے ایک نوجوان سیٹھ نے ہمیں ایک گاڑی بھیج دی۔

ہم ہوٹل کی لفٹ سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک عرب شیخ' ہوٹل کے استقبالیہ کی لڑکیوں میں سے ایک کو اوپر لے جا رہا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور تھے۔ شیخ صاحب نے کبھی اتنی خوش شکل' خوش وضع' اور خوش اطوار لڑکی نہیں دیکھی ہو گی اور اس لڑکی نے کبھی ایسی مخلوق نہیں دیکھی تھی جو سرتاپا سونے جواہرات میں منڈھی ہو۔

میرے ملک کا ایک لڑکا جب ہر بوتل پر "شیک" دی بائل پڑھتا تو سوچا کرتا تھا کہ یہ شیخ بھلا کون ہے۔ یہ کوئی بڑا امیری ہو سکتا ہے جو ہر بوتل پر اس کا نام لکھا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں شیوخ کے اس قبیل سے کوئی واقف نہ تھا۔

یہ لوگ پہلے پہل ہمارے ہی ہاں آئے تھے۔ لیکن زیادہ دنوں ان کا یہاں جی نہ لگا۔ کیا کرتے۔ اپنے صحرائے عرب میں بھی اسلام اور اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی اسلام۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انہیں اپنی جبلی خواہشوں کی خاطر اپنے ہاں بہت زیادہ چھپنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی چھپنا چھپانا تو تھا مگر ذرا کم —— لندن پیرس گئے۔ واہ واہ کیا بات ہے ان شہروں کی۔ لیکن وہ دور پڑتے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ بمبئی' دہلی کی فضاؤں کی سرپرستی کی جائے۔ کم از کم یہاں گھٹن تو نہیں۔ اچھی بری سب باتیں کھل کر ہوتی ہیں۔

مغلوں' ترکوں اور افغانیوں کی فاتحانہ پیش قدمی پر سیخ پا ہونے والے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہندوستان نے عربوں کے لئے اپنے بازو کھول دیئے۔

ہوٹل تاج محل کی لابی میں سے دو صحت مند عرب عورتیں اپنے جھلملاتے بچے سنبھالے پورچ میں کھڑی سفید مرسڈیز میں فٹ ہو رہی تھیں وہیں لابی کے ایک کونے میں ایک عرب کاؤنٹر بنا ہے۔ جہاں انہی کا ہم زبان ایک نوجوان ہندوستانی ڈیوٹی دے رہا تھا تاکہ عرب مردوں اور عورتوں کی حاجت روائی کر سکے۔

میں دو دن تک باہر اور صبیح الدین کی صورتیں دیکھتی رہی تھی۔ اب میں نے جانے بوجھے دو دن تک ان کی خبر نہ لی۔ وہ دونوں مجھے اس طرح پیٹرونائیز کرنے لگے تھے کہ میرے اندر کی خودمختار ریاست مجھ سے چھنتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں منظر سے ہٹے تو بمبئی آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا تھا۔

کامارو ڈ پر واقعہ گیسٹ ہاؤس کی چوتھی منزل سے باہر سڑک کی طرف دیکھا۔ برسوں پرانے درخت کی ایک بے برگ شاخ سے ایک پرندہ کنکریٹ کی رکاوٹوں سے بلند ہوتا اور شام کی دودھیا روشنیوں کو پھلانگتا کہیں دور نکل گیا۔

میں سڑک پار کرنے کے لئے رکی تھی۔ عین چوک میں سفید نیکر بنیان پہنے ایک مرد' سوتی بلاؤز اور جینز والی لڑکی کو لپٹائے کھڑا تھا۔

اس وقت بمبئی ایک بردبار' متحمل مزاج بین الاقوامی شہر ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ ٹریفک چلتی رہی' اپنے اپنے کاموں سے لوٹتے' گھروں کی طرف جاتے لوگ بس اسٹاپ پر قطار لگائے ہوئے تھے۔

ایک چھوٹا سا صاف ستھرا' دھیمی سرخ روشنیوں والا ریسٹوران' دائیں جانب ایک غیر ملکی سیاح اپنی بیئر کی آدھی بوتل گلاس میں انڈیل کر نوٹس بنانے میں مشغول ہو گیا تھا۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانے کے انتظار میں تھی۔

کسی نے انگریزی میں کہا۔ "میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

جی' پلیز۔

وہ سفید ساڑھی میں ملبوس عصمت چغتائی کے سے حلئے بشرے والی ایک گوان خاتون تھی۔

"ہیلو"

ہیلو جی"

وہ بیرے پر چلائیں "لاؤ ہمارا برانڈی اور گرم پانی ---"

"میں شام کو کبھی کبھار یہاں آ جاتی ہوں۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں اور پھر بیرے کو آواز دی۔

"دیکھو' جاؤ' ٹیکسی والے کو یہ پیسے دے آؤ" عورت کی خود اعتمادی بھلی لگ رہی تھی۔

"میرے تمام بچے شادی شدہ ہیں۔ دو بیٹے امریکہ میں اور بیٹی آسٹریلیا میں ہے۔ میں کملا ایسوسی ایشن کی صدر ہوں۔" ایک ہی سانس میں اپنا تعارف کروا دیا۔ کئی بچوں کی ماں کی بڑھاپے میں تنہائی نے غمازی کی۔ کملا ایسوسی ایشن کی مصروفیات؟ تنہائی سے بچنے کا بہانہ

"یہ کیا ہے؟" میں نے بات آگے بڑھائی۔

یہ اس عمارت کا نام ہے جس میں میرا فلیٹ ہے۔ ہم نے یہ ایسوسی ایشن اس لئے بنائی ہے کہ اس عمارت کے مکینوں کی شکائتیں رفع ہو سکیں۔" گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

"اے چھوکرا ادھر آؤ۔ اس کو بولو کہ گانے کی آواز ہلکی کرے" اس وقت ریسٹوران میں محمد رفیع کا کوئی شربیلا گانا بج رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ یہ زبان میری سمجھ میں نہیں آتی"

لوسو انڈین کی معذرت

لوسو انڈین --- واس گوڈی گاما اور اس کے ساتھیوں کی پیداوار۔ ہندوستانی خون میں ہندوستانی رنگ و روپ' جنوبی ہندوستان کا سلونا پن' کیتھولک تہذیب اور طرز فکر مغربی' یورپ اور امریکہ میں بسنے کی آرزو۔ ہندوستان میں کچھ اچھا نہ لگا تو کراچی آ کر سرسٹ اسٹریٹ کی دکانوں کے اوپر فلیٹوں میں بس گئے۔ بندر روڈ پر کراچی گوآن کلب بنا لیا۔ موقع ہاتھ لگا تو کینیڈا چلے گئے۔

میری ہم نشین نے برانڈی ختم کی۔ پرس اٹھایا کہا۔ "یہ میرا فون نمبر ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو فون کر لینا"

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہندوستان میں رہے۔ ہندوستانی زبان نہیں سیکھی۔ گاما اگر انہیں اپنے ساتھ لے جاتا تو یہ پرتگالی زبان ضرور سیکھتے۔ اس کے بنا چارہ نہ تھا۔ مگر گاما نے جو ستم ڈھایا سو ڈھایا۔ جانی (Johany) نے اس سے بڑا ظلم ڈھایا۔ پرتگالی گاما نے انہیں جڑ سے اکھیڑا اور برطانوی انکل جان نے ان کی شاخیں کاٹیں اور سمندر میں بہا دیں۔

بابر فون پر کہہ رہا تھا۔ ہم دونوں کل گوآ چلے جائیں گے میں نے بتایا کہ میں دو تین روز میں دہلی چلی جاؤں گی۔ وہ بضد تھا کہ وہ دونوں مجھے کسی سے ملوانے لے جائیں گے۔

"دیکھو بابر' تم دلیپ کمار کے چکر میں نہ پڑنا۔ ہم سمیتا پاٹل سے مل چکے ہیں۔ شبانہ اعظمی بمبئی میں نہیں ہیں۔ کیفی اعظمی اعظم گڑھ میں ہیں۔ تو بھلا اور کون ہے جس سے ہم ملنے جائیں۔ لے دے کے سردار جعفری رہ گئے ہیں۔"

مجھے یقین تھا کہ سردار جعفری مجھے نہیں پہچانیں گے حالانکہ وہ جب بھی کراچی آتے ہیں ان سے کسی نہ کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ گذشتہ بار کراچی آئے سبط حسن صاحب کے بیڈروم میں بیٹھے تھے۔ کچھ ان کی باتیں سنیں کچھ انہیں کہی۔ انہیں خراج تحسین پیش کیا "جعفری بھائی' آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ ہر سال کراچی آتے ہیں اور ہر بار ہٹ ہو جاتے ہیں۔" بابر بہت اترایا پھرتا کہ اس کے پاس سردار جعفری کے نام سبط بھائی کا خط ہے۔ جب وہ خط دے کر لوٹا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ اسے کوئی لفٹ ملتی تو اس کے قصے سنا سنا کر میرا سر کھا جاتا۔

بابر اور صبیح دونوں مجھے لینے آئے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور مسلمان تھا۔ کہہ رہا تھا "صاحب کیا آپ لوگ کراچی سے آئے ہیں۔ میرا باپ بھی کراچی میں رہتا تھا وہ کچھ روز پہلے مر گیا صاحب۔ اس کی جائیداد پر رشتے داروں نے قبضہ کر لیا ہے۔ میرا وہاں کوئی جاننے والا نہیں کہ اپنا حق مانگنے کی کوشش کر سکوں۔

فلورا فاؤنٹین کے گرد چکر کاٹتے ہوئے وہ اپنی داستان سنا رہا تھا۔ ہم تینوں ہندوستان میں رہنے والے مسلمان کو کراچی بلا کر اس کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار

ہو چکے تھے۔ یعنی صبیح الدین اس کی وکالت کریں گے۔ میں اس پر مضمون لکھ کر بمعہ تصاویر اخبار میں چھاپ دوں گی۔ بابر اسے کسی سیٹھ کے ہاں نوکر کروا دے گا۔

راستہ ختم ہو گیا۔ اور ارادہ بھی۔ کرائے کی رقم جیب میں ڈال کر ٹیکسی والے نے ایکسیلیٹر دبایا اور ہم کچھ تنگ سی گلیاں مڑتے' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک دفتر میں داخل ہو چکے تھے۔

ایں' یہ کیا' قائداعظم' ہمارا بابا۔ ان کے باپو کے مقابلے کا۔

مزار قائد کی تصویر۔ بمبئی کے ایک دفتر میں!!

یہ دفتر مزار قائد کے خالق آرکیٹیکٹ یحییٰ مرچنٹ کا تھا۔ مرچنٹ صاحب کی پیش کش تھی کہ وہ ہمیں بوہرہ فرقے کے سربراہ سیدنا طاہر کا مزار دکھانے لے چلیں گے۔ جی خوش کرنے والی بات تھی۔ یہ مزار بھی انہی نے ڈیزائن کیا اور اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا۔

کراچی جیسے ٹریفک کو چیرتے ہوئے ہم بھنڈی بازار سے گذر رہے تھے۔ دوکانوں' ریڑھیوں' کھوکھوں خوانچوں سے اٹھنے والا کاروبار' ریشمی رومالوں' سلکی ساڑھیوں' رنگ دار ازار بندوں۔ ضرورت' استطاعت اور رسد کے مابین سوداگری۔ منٹو اور کرشن چندر کے بتائے ہوئے لوگوں کی بدحالی۔ محرومی کے سامنے کا منظر سیلی اور تنگ و تاریک کھولیوں پر پردہ ڈالنے والا اور چوباروں کے نیچے کا منظر

شہر کی گنجان آبادی۔ وقت کے ہاتھوں گھسی ہوئی بھی اور پٹی ہوئی بھی۔ اس علاقے کے دوکاندار ہر طرح سے مسلمان لگ رہے تھے۔ اپنی دیگوں سے' شلوار قمیضوں سے' داڑھی مونچھوں اور دوپلی ٹوپیوں سے۔

مزار کے اندر کا منظر چھت کے کونوں سے لٹکتے فانوسوں سے روشن تھا۔

یحییٰ مرچنٹ کی آواز میں افتخار تھا۔ کہنے لگے۔ کیا آپ نے کبھی خود کو قرآن کے اندر گھرے ہوئے دیکھا ہے۔"

کئی سوال ذہن میں آئے۔ جسمانی طور پر' نظریاتی طور پر' یا تصوراتی طور

allurdupdfnovels.blogspot.com

پر؟

یہاں جسمانی گھیراؤ تھا۔

حجرے کی چاروں دیواروں پر قرآنی آیات' پتھر میں کندہ' سونے کے پانی سے شرابور ہمارے میزبان کی محنت اور فن' عقیدے کی مضبوطی' یادگار کی تعمیر' ترتیب و تنظیم کا کمال' خطاطی کا آغاز ہوا۔ ایک ہی لہک' ایک سی روانی' حروف کی سطروں میں ہم آہنگی' حرف آخر' حرف اول سے آملا چاروں دیواروں کا احاطہ کرتا ہوا۔

ایک عقیدت مند مزار کے اندر داخل ہوا۔ لمحہ کے پاس گیا۔ دعا کی۔ اسے چوما اور آنکھیں موندے کھڑا رہا۔ دیر تک۔

میں نے کیمرہ اٹھایا۔ میزبان نے روک دیا۔ یہ ان کا اور ان کے فرقے کا اندرونی معاملہ تھا۔ نہ تشہیر مقصود تھی اور نہ کسی غیر متعلق شخص کے سوال کے جواب کا کوئی امکان۔

ہم نے وہ شام اپنے مہربان بزرگ کے ہمراہ گذاری جو اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ میں دہلی سے بمبئی لوٹوں تو انہی کے پاس ٹھہروں اور ان کی جرنلسٹ بہو سے ضرور ملوں۔ مرچنٹ صاحب ہمیں سی سی آئی لے گئے۔ کھانا کھلانے۔ ایک وقت میں بمبئی کا مقبول کلب۔ اونچے طبقے والوں کا۔ کاب کے بید کے صوفوں سے' بیروں کی وردیوں سے' کشادہ دلانوں اور باغیچوں کی وسعت سے' ان سب کی اداسی سے کولونائزیشن (نوآبادکاری دور) کی باس آ رہی تھی۔

برطانوی راج کا موہنجودڑو۔

ایک روز پہلے شام کو ٹہلنے کی غرض سے گیٹ وے آف انڈیا کی طرف جا رہی تھی کہ کچھ بھیڑ نظر آئی تجسس پیدا ہوا۔ اشتیاق بڑھا۔ بعض لوگ گیٹ وے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے جمگھٹے میں شامل ہو کر اس طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد سر پر چھجے والا سفید ہیٹ اور گلابی اسکرٹ بلاؤز پہنے ہالینڈ کی شہزادی بیٹرکس وارد ہوئی۔ بسالٹ پتھر سے بنے ہوئے محرابی دروازوں کے اندر سے گذرتی ہوئی برطانیہ کے بادشاہ جارج پنجم کے ورود ہند کی یادگار۔ مگر جب

بیسویں صدی کی ڈچ شہزادی وہاں پہنچی تو شہری کثافت سے پتھر کا زرد رنگ بھورا پڑ چکا تھا۔

پلوں کے نیچے سے بہت پانی گذر چکا۔ مگر یورپی شہزادے اور شہزادیاں مقامی لوگوں کے لئے اب بھی دیکھنے کی چیز ہیں۔ وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ شہزادی مسکرا کر ہاتھ ہلاتی ہوئی بڑی سی سرکاری گاڑی میں بیٹھ کر چلدی تھی۔

میزبان کو رخصت کر کے اب ہم تینوں تاج محل کے سامنے سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ جنوری کے مہینے میں بمبئی کے موسم سے سرما اسی طرح ناپید تھا جیسے اس نوعمر لڑکے کے وجود سے ہوش و حواس' جو گیٹ وے کے قریب سیمنٹ کے بنچ پر بدمست لیٹا تھا۔ اس کے جسم کی سیاہ رنگت میل کچیل' پھٹے وار پاجامہ اور ڈیوں والی قمیض سب یک رنگ ہو رہے تھے۔

سیمنٹ کی دیوار سے بندھی کشتیوں کو پانی پر چھل چھل کرتے دیکھا تو جی للچایا۔ سمندر کی سیر کے لئے پھر میں ان سب کے ساتھ ہولی جو دو روپے کی ٹکٹ میں عیاشی کرنے آئے تھے۔ اپنی کھولیوں اور چالوں سے نکل کر تازہ ہوا کھانے کی غرض سے

شفق پانی میں گھلی تھی' لال لال' گلابی گلابی لہروں میں تیرتی' اپنے انگ بناتی دور تک پھیلتی گئی تھی۔

بے بس کر دینے والا سماں

میرے ہم سفر' مرد' عورتیں اور بچے سلونی رنگتیں۔ بے سلجھے بال۔ بے دھلے چہرے وہ سب جھٹپٹے کے خوبصورت منظر سے سرشار تھے میرا جی چاہا کہ ان لمحوں کو' اس منظر کو' پورے کا پورا' بہت سارا' کیمرے میں مقید کر لوں۔

میں نے اس نیم بے خودی کے عالم میں نہ جانے کس کس زاویے سے تصویریں بنائیں۔

آسمان اور سمندر۔

ان میں سے کبھی کبھار کوئی مجھے دیکھتا۔ شاید حیران ہوتا ہو گا۔ میں انہیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

دیکھتی۔ حیران ہوتی کہ یہ لوگ اپنی تمام تر بدحالی' کم مائیگی کے باوجود اپنی گلیوں کوچوں سے باہر آ جاتے ہیں۔ اس لئے تو یہ جیتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی اس وقت اپنی آزاد روی' اپنی زندگی' اپنا آپ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ سب کچھ کھلا کھلا سا تھا۔

ایلی نیشا جانے والی کوچ میں سوتی ساڑھی پہنے گائیڈ خاتون نے فرفر انگریزی بولنی شروع کر دی تھی۔ اس نے ایلی نیشا کو متعارف کراتے ہوئے بتایا کہ پرتگالی جب رات کے اندھیرے میں اس جزیرے پر پہنچے تو ان کا ہاتھ کسی لمبی سی چیز پر جا پڑا۔ وہ سمجھے کہ ہاتھی کا سونڈ ہے بس اسی روز سے اس جگہ کا نام ایلی نیشا پڑ گیا۔

ایلی نیشا کا جزیرہ گیٹ وے سے صرف 6 میل کے فاصلے پر ہے۔ تیز رفتار لانچ سے بحری راستہ پل دو پل میں بیت گیا۔ لیکن مشکل مرحلہ تو سامنے کھڑا تھا۔ غار مندر تک پہنچنے کے لئے سینکڑوں سیڑھیاں پھلانگنے کا مرحلہ۔ ساحل پر مقامی مچھیروں کی عورتیں اپنی کالی کالی ٹانگیں آدھی ننگی کئے' رنگ برنگی ساڑھیوں کو بھوک سے سوکھ جانے والی پسلیوں پر لپیٹے۔ سروں پر گاگریں اٹھائے امریکی سیاحوں کو متوجہ کر رہی تھیں "پھوٹو' پھوٹو ون ڈالر۔" مغربی خوشحالی کے سامنے مشرق کی غربت کا پھیلا ہوا ہاتھ۔ جی دکھ رہا تھا۔

غار کی جانب بڑھتے ہوئے درختوں کی ٹہنیوں پر اچھلتے کودتے بندر' ہنومان کے ہم نسل' ہندو مائی تھولوجی کا اہم کردار۔ بندر معصوم لگ رہے تھے اور وہ کتنا تنہا اور بے بس تھا' جو جھاڑی کی اوٹ میں لیٹا ہوا تھا۔

ستونوں کے سہارے کھڑی پتھریلے پہاڑ میں کھودی ہوئی غار کی چھت۔ جاتے ہی شیو کی مش مورتی پر نظر پڑتی ہے۔ شیو کے تین روپ وہ جو تخلیق کار ہے۔ محافظ ہے اور تباہ کار ہے ہر چہرے کا الگ الگ تاثر۔ بھرپور تاثر۔

پرتگالیوں نے اس غار کو بارود سے اڑانے کی جسارت کی تھی۔ بہت کچھ تباہ ہو گیا۔ پھر بھی یہ مورتیاں بچی رہیں۔ بارود جو پہاڑوں' مکانوں کے پرخچے اڑا دے۔ مگر وہ پتھر کی صلابت اور اس کی فولادی ساخت کے سامنے پسپا ہو گیا تھا۔ مگر

وہ سلپن' جو اپنے عقیدے کے زور پر' منتر پڑھ پڑھ کر ان پتھروں کو تراشتا تھا۔ اور تراشتے تراشتے کتنی لیلائیں کہہ ڈالیں۔ کیسی شکتی تھی اس میں۔

ایلی نیشا کی ہندو مت کے غار مندر بدھ مت کی گھاؤں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ مجسمہ سازی کا یہ انداز جو شمالی ہندوستان اور جنوبی ڈراوری طرز تعمیر سے متاثر تھا۔ تری مورتی کے علاوہ شیو بطور نٹ راج اور پاروتی کے ساتھ جو شیو کی شکتی تھی' شادی کا منظر۔ موضوع کے تمام تقاضے بخوبی پورے ہوئے۔ جسمانی خدوخال کی تراش' پاروتی کے زیورات کی تفصیلات۔ پاروتی کے بالوں سے نکلتی ہوئی گنگا۔ ہندوستان کی قدیم طرز معاشرت کی کہانی۔ کیلاش کی بلندیوں سے اڑنے والی' سوکھی پیاسی زمین کو سیراب کرنے والی گنگا کی کہانی۔

فرائیڈ کہتا ہے مجموعی طور پر مذہب کی بنیاد بنی نوع انسان کے اوئیڈپس کو پیلکس پر رکھی گئی ہے۔ ایلی نیشا میں عقیدت مندوں نے اپنے خدا کی شبیہہ کو بڑی محبت سے تراشا تھا۔ خدا جس سے بیک وقت خوف کھایا جاتا ہے۔ اسے چاہا جاتا ہے۔ اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ جس سے محبت کی جائے' جس سے نفرت کی جائے۔ جس پر غصہ اتارا جائے۔ شکایت کی جائے۔

فرائیڈ سوچتا ہے۔ تمام ترغیب یہ ہے کہ ہمیں اس پر یقین کرنا چاہئے کہ ہمارے آباؤ اجداد اس پر یقین رکھتے تھے' لیکن ہمارے اوپر آپ کے بڑے اپنے اپنے زمانوں میں ان سب پر یقین رکھتے تھے کہ آج ہمارے لئے جن پر یقین کرنا ممکن نہیں۔

وقت آگے کی طرف بڑھتا ہے۔

ایلی نیشا کا دور چندر گپت کا دور تھا۔ بدھ مت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ مگر گوتم بدھ کی مورتیاں بنانے والے سپلن شیو کو تراشتے گئے تو غیر ارادی طور پر اپنے پہلے تجربوں سے استفادہ کئے بغیر نہ رہ سکے۔

فن اپنے نئے تجربے کو اتنا تخلیق نہیں کرتا جتنا وہ اپنے پرانے مشاہدے اپنی مشق اور اپنی سابقہ مہارت سے نئے کام میں گہرائی اور نفاست پیدا کرتا ہے پھر نئی تہذیب پرانے طریقوں کے نو ستلیاے اعتماد حاصل کرتی ہے سلسلے ایک دوسرے

allurdupdfnovels.blogspot.com

سے ملتے رہتے ہیں۔

غار میں روشنی وافر تھی اس لئے کہ غار کا دہانہ مغرب کی طرف کھلتا تھا۔ یوں بھی غار کو دور سے دیکھو تو یوں لگتا ہے جیسے ہم ایک پرانے گھر کے کشادہ برآمدے کی طرف بڑھ رہے ہوں۔

میں کیمرے کی فلیش گن درست کر رہی تھی ایک عمر رسیدہ' دبلا پتلا مرد جو ہندوستان کی وزارت اطلاعات کا فوٹوگرافر تھا اور آثار قدیمہ کی تصویریں بنانے پر متعین تھا مجھے تاکید کر رہا تھا کہ میں کنیری کی غاریں ضرور دیکھتی جاؤں۔ وہاں بھی بہت اچھی مورتیاں ہیں۔

کمزور انسان نے جو سوچا' جو چاہا بنا دیا۔ اپنے اپنے خدا جو صحت دے' عزت دے' روزی دے۔ گرم ملکوں کے لوگ اپنے خدا سے' سرد ملکوں کے لوگوں کے مقابلے سے زیادہ مانگتے ہیں اس لئے کہ سرد ملک میں رہنے والوں نے فطرت کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ گرم ملک اپنی فطرت میں انسان کی قوت سے زیادہ طاقتور ہیں انہی ملکوں میں قحط پڑتے ہیں۔ منہ زور سیلاب آتے ہیں۔ پھر انسان اس قوت کو تلاش کرتا رہتا ہے جو اسے روٹی دے' گھر دے' صحت دے' اسے کپڑے دے۔

مذہب کا نظم و ضبط نہیں تھا تو رشتوں کی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ کوئی ضابطہ اخلاق نہیں تھا اچھے برے کی تمیز نہیں تھی۔ مذہب نے خوشیاں دیں سکون قلب دیا ——ایک آراء۔

ایک سوال ہوا میں معلق ہے۔ لیکن انسان آج بھی بہت دکھی ہے۔ مضطرب ہے بے سکون ہے۔

مذہب نے حقائق سے فرار حاصل کرنے کے لئے پناہ گاہ دی۔

یہ بھی تو۔

واپسی پر گیٹ وے سے کالا روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ لڑکی۔ اونچی لمبی' نیلی جینز اور سفید بلاؤز پہنے۔ میرے ساتھ ہو لی۔

او ہیلو۔

ہیلو۔

میں صبح سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔

"تو"!!

تم بہت پر اعتماد لگتی ہو۔

"ہاں تو"

میں لندن جا رہی ہوں۔ آسٹریلیا سے آئی ہوں۔ کس کو نہیں معلوم کہ میں بمبئی میں ہوں میں یہاں سے دہلی جاؤں گی۔ ہاں سنو۔ تم شام میں کیا کر رہی ہو؟ میں بھی اس ہوسٹل میں ٹھہری ہوں۔ تم دہلی جاؤ گی کیا کہاں ٹھہرو گی؟ اس نے ایک ہی سانس میں بہت سارے سوال کر ڈالے۔ کئی جواب دے دیئے۔

میں شام کو نریمان پوائنٹ سے لوٹ رہی تھی وہ گیٹ وے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے صبح کی سرراہ شناسائی کو کچھ آگے بڑھانا چاہا۔

"ہیلو" ——وہ انجان بنی تھی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ وہ صبح کے وقت مجھے بتا رہی تھی کہ کسی کو خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس وقت اسے خود خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔

یہ لوگ عموماً اس لئے بھی ان ملکوں میں آتے ہیں کہ انہیں یہاں سستے "سونے" مل جاتے ہیں۔

مجھے وائی ڈبلیو سی اے کے انٹرنیشنل ہوسٹل میں پورا کمرہ نہ ملا تو آدھے پر ہی اکتفا کر لیا۔ میرے ساتھ ایک فرانسیسی عورت رہتی تھی۔ جودھ پور کے ایک اسکول میں موسیقی پڑھاتی تھی مجھے اس کی مسکراہٹ نہ جانے کیوں بھدی لگتی تھی۔ جودھ پور میں بیمار پڑ گئی تو بمبئی آ گئی وہ سارا دن بے مقصد گھومتی رہتی۔

ایک روز کچھ چینی جاپانی سی لڑکیاں اسکے پاس بیٹھی کھسر پھسر کر رہی تھیں اسے کھانے کو کچھ گولیاں کچھ کیپسول دیئے تاکہ وہ بے سدھ پڑی رہے۔

میری فرانسیسی روم میٹ کے پاس اتنے کپڑے نہ تھے جتنی کہ جوتیاں'

allurdupdfnovels.blogspot.com

چپلیں، سینڈل، واکنگ شوز، کورٹ شوز وہ ہر بار باہر جاتی تو ایک نیا جوتا نکال کر پہن لیتی۔ اسے نہ جانے کیسا دکھ تھا۔ وہ جو موسیقی کی استاد تھی اندر سے کیوں بیمار پڑ گئی تھی۔

جہانگیر آرٹ گیلری میں تصاویر کی دو تین نمائشیں لگی تھیں۔ ذرائع ابلاغ کی وسعت اور آسانی کی بدولت فنون لطیفہ کی بین الاقوامی جہتوں کے اثرات ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی سے منتقل ہو جاتے ہیں۔ وہ پال کلی کا کیوب ازم ہو یا ایکسپریشن ازم ان تحریکوں کے اثرات دور دور تک گئے۔ جس طرح دوسروں کو ہم اور ہمارا ملک بہت دقیانوسی لگتا ہے اسی طرح ہندوستان جانے سے پہلے یہ گمان تھا کہ یہ ملک، اس کے فنون لطیفہ اپنی دیومالاؤں اور دیویوں کے اثر سے اب تک نہیں نکل سکے۔

جہانگیر آرٹ گیلری کی تصاویر میرے خیال کو جھٹلا رہی تھیں۔ وہاں کچھ اچھی اور کچھ غیر معیاری تصویریں لگی تھیں۔ میں ایک نوعمر مصور کی لینڈ اسکیپنگ پر اچٹتی سی نظر ڈال کر آگے بڑھی تو ایک جوڑا ہال کے عین بیچ میں میز کرسیاں ڈالے بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ دونوں ایسے سبھاؤ سے بیٹھے تھے کہ یہ جان لینا مشکل نہ تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ عورت سانولی سلونی، ساڑھی پہنے، بندیا لگائے۔ مرد فرانسیسی تراش کی داڑھی۔ سڈول جسم، پکا رنگ۔ میں ان سے متعارف ہوئی۔ وہ سریش چوہدری تھے اپنی پتنی کے ساتھ بھوپال سے آئے تھے۔ انہی کی تصاویر کی نمائش لگی تھی۔

سریش چوہدری کا لہجہ دھیما تھا۔ لیکن ان تصویروں میں لپک تھی۔ حرکت تھی، تیزی تھی۔ ان کے لہجے میں زندگی کی ناآسودگیوں کی رمق تھی۔ تصویروں میں خفگی اُمڈی پڑی تھی۔ سمندر کی بپھرتی ہوئی لہریں۔ تاریکی میں لپکتے ہوئے شعلے اور کانپتی ہوئی شعاعیں گھوڑے کی سرپٹ دوڑ سے اٹھنے والی دھول

ایک بے قراری کی سی کیفیت۔

بھوپال کے المیہ کا دکھ۔ ان تصویروں میں کچھ تفصیل نمایاں تھی۔ شعلوں میں لپٹی ہوئیں انسانی چیخیں۔ پس منظر میں تشدد اور تباہ کاری میں بھسم ہوتے ہوئے جسم۔ مدد کو پکارتی ہوئی آنکھیں۔ رحم کی خواستگار نظریں۔

فن کار کا احساس زخمی تھا۔

المیہ ہو چکا، سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیاں حرکت میں آ گئیں۔ اخبارات کے پہلے صفحات نے بھوپال ٹریجڈی، سے شہ سرخیاں بنائیں۔ خون بہا ادا کیا گیا۔ زخموں پر مرہم رکھنے کی سعی کی گئی۔ کچھ وعدے وعید ہوئے۔ مگر سریش چوہدری کے دوست کا طوطا جو اس سانحے میں جاں بحق ہو گیا تھا اس کے لئے کوئی کلیم نہیں بھرا گیا۔ نہ ہی سبز پتوں والے لیموں کے اس پیڑ کے نقصان کا کوئی ازالہ ہو سکا جو آگ میں جل گیا تھا

ایلی نیشا کے پتھر میں تراشے ہوئے منظر میں بگلے تیر رہے تھے۔

قدیم انسان نے سنی سنائی کہانیوں کو پتھر کی زبان میں بیان کیا تھا۔ سریش چوہدری کا شعور مشاہدے واقعات اور حالات سے جاگا تھا۔ اس کے رنگوں میں گھلا تھا۔ تاریکی کے رنگ، جنگل کے رنگ، پانیوں کے رنگ، روشنی کے رنگ، شفق کے رنگ۔

قدیم آدمی، ذہنی پسماندگی کے باوجود اپنے گردوپیش کی سختیوں، حالات کی بے رحمی، زندگی کی بے اطمینانی کے بارے میں حساس تھا وہ دنیا کو بے یقینی سے دیکھتا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت چھوٹا اور کمزور معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس نے ایک ایسی دنیا بنائی، ایسے دیوتا تراشے جنہیں وہ بڑا درجہ دے سکے۔ وہ سب کچھ مستقل تھا اور اسے تغیر پذیر دنیا سے بہتر معلوم ہوتا تھا۔

یہ اس کا تجریدی فن تھا۔

ہم لوگ، میں، بابر اور فصیح کہیں جانے کی غرض سے وکٹوریہ ٹرمینل کے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ بمبئی میں لوکل ٹرین کا نظام بڑا مستعد اور خودکار ہے۔ کھٹا کھٹ کرتیں تیز رفتار گاڑیاں۔ شہر میں آ کر کام کرنے والے اور کام سے گھر لوٹنے والے تیز تیز قدم اٹھاتے لوگ۔ بمبئی کے کاسموپولیٹن کردار کی جھلک۔

ساڑھیاں پہنے۔ کتابیں اور فائلیں بغل میں دبائے چھپاک سے نکل جانے والی لڑکیاں میرے ساتھیوں کو مضطرب کر گئی تھیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایک گاڑی ہمارے سامنے رکی۔ ڈبے کا خود کار دروازہ کھلا اور ہم تینوں اس میں سوار ہو گئے۔ کچھ جوانسال لڑکیاں' کچھ بوڑھیاں' ساڑھی کے پلو سے اپنا آدھا چہرہ ڈھانپے۔ لڑکیاں پٹر پٹر باتیں کرتی ہوئیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں احساس ہوا کہ کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ دراصل وہ خالص زنانہ ڈبہ تھا۔ سوچ رہی تھی کہ اب باہر اور صبح کا کیا کروں۔ بمبئی کے کسی مقامی ریلوے کا یہ خالص مشرقی انداز تھا۔ عورت مسلمان ہو' ہندو ہو' سکھ یا عیسائی ہو' ایسے میں الگ تھلگ بیٹھ کر ہی خود کو محفوظ پاتی ہے۔

بمبئی کے ایک بس اسٹاپ پر مالی تنگدستی گالی گلوچ بن کر برس رہی تھی۔ حالانکہ ایسی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ایک قندیل جسم پر گیٹس کے سہارے دو نالیوں والا تھیلا چڑھائے ایک بابو جلدی سے بس پر چڑھنا چاہتے تھے کہ ایک سوکھا' کالا بے چارہ لڑکا اچک کر پائیدان پر سوار ہو گیا۔ بابو جی کو اس کی اس جسارت پر بہت غصہ آیا پہلے اسے ماں کی گالی دی پھر اس کی ماں پر الزام دھرا کہ اس کا کوئی باپ ہوتا تو ایسی حرکت نہ کرتا۔ احمق کہیں کا۔ ارے' باپ تو باپ ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ ماں کے ساتھ رہے یا ماں کو ورغلانے کے بعد دغا دے جائے۔

ہم تینوں بہر حال کسی نہ کسی طور بس میں سوار ہو گئے تھے۔ ڈیش بورڈ پر بیلوں کی مورتیاں دیکھ کر کچھ دیر کو ہم نے ایک دوسرے سے کچھ سوالات کئے۔ شیو کا بیل نندی' شیو کی سواری۔ نندی کی مورتی ڈیش بورڈ پر اس طرح رکھی' کچھ ویسے ہی مقصد کے لئے جیسے ہمارے ہاں کی بسوں میں ڈیش بورڈ کے اوپر نصر من اللہ وفتح قریب یا ایسی دیگر بابرکت آیتیں لکھی ہوتی ہیں۔

نیویارک کی سب وے میں بیٹھ کر' سان فرانسسکو کی بارٹ میں سفر کرتے ہوئے' پیرس کی میٹرو یا لندن کی ٹیوب میں بیٹھے کہیں پر بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ لوگ کیتھولک ہیں' پروٹسٹنٹ۔ لیکن بمبئی اپنے کاسمو مزاج کے باوجود' کبھی ماتھے کی بندیوں سے' کبھی نشان کے انداز سے کبھی برگد کے نیچے چھوٹے سے مندر میں سجی مورتیوں سے اپنے رواجوں' رسموں اور روایتوں کی جھلک پیش کرتا ہے۔

ہندوستان جا کر' ہندوازم سے ٹکرانا ناگزیر ہے۔

مجھے دہلی کے لئے اجنتا ایکسپریس کا ٹکٹ چاہئے۔

ریلوے کلرک نے فوراً تصحیح کی۔ اجنتا نہیں جنتا۔ ارے ہاں۔ وہی' میرا مطلب جنتا ایکسپریس ہی سے ہے۔" جسے ہم عوامی ایکسپریس کہتے ہیں۔

"نہیں ہے؟" روکھا سا جواب "تو پھر راجدھانی ایکسپریس کا ٹکٹ ہی دے دو۔" لیکن جب میں نے یہ بتایا کہ ٹورسٹ ہوں تو وہ جنتا ایکسپریس کا ٹکٹ دینے کو تیار ہو گیا۔ ہندوستان میں سیاح بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں عزت اور رعایت دی جاتی ہے۔ اس لئے ریل گاڑیوں میں سیاحوں اور خصوصاً غیر ملکی سیاحوں کے لئے سیٹوں کا خصوصی کوٹہ رکھا جاتا ہے۔

راجدھانی دہلی روانگی کے لئے تیار تھی میں نے اپنا سوٹ کیس بہت شدومد کے ساتھ سیٹ کے اندر فٹ کر دیا تھا پھر جو اپنا سیٹ نمبر دیکھا تو وہ کچھ اور نکلا۔ کیا کروں۔ بڑی مشکل ہو گی۔ ٹکٹ چیکر کو اپنی بپتا سنائی اور کہا کہ کیا حرج ہے' اگر میں یہیں بیٹھی رہوں اور اس سیٹ پر کوئی اور بیٹھ جائے جو میرے لئے بک کی گئی ہے۔ وہ جھٹ سے مان گیا۔ لیکن میں ساری رات سوچتی رہی کہ کاش وہ ہٹ دھرم ہوتا اور کہتا کہ نہیں جی۔ سیکورٹی کا معاملہ ہے۔ آپ کو اسی سیٹ پر بیٹھنا ہو گا جو آپ کے لئے بک کی گئی تھی۔ ہوا یہ کہ تھوڑی دیر میں ایک لمبے اونچے اور قندیل صاحب آ کر جم گئے۔ شکل و صورت بری نہ تھی۔ عمر بھی ٹھیک تھی۔ لیکن نہایت بد مزاج۔ ہونٹوں کے کناروں پر نسواری نشان بتا رہے تھے کہ وہ پرانی دہلی میں رہنے والا مسلمان ہے۔ پیٹ کی یہ حالت بھی نہاری' پسندے اور بریانی کھانے سے ہی ہوتی تھی۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ساتھ والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہو یا بیٹھی ہو تو رسماً "علیک سلیک ہوتی ہے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ اچھا دہلی میں وہی رہتے ہیں کیا۔ او۔ پاکستان سے کیا دہلی میں کوئی عزیز نہیں۔ نہیں' دوست ہیں۔ بس ایسے ہی سیاحت کے لئے نکلی ہوں —— نہیں صاحب۔ موصوف کیا سامنہ بنائے اپنے سامنے والی سیٹ کی نشست کو تاڑتے رہے اور میں اپنے آپ کو کھڑکی کے ساتھ

allurdupdfnovels.blogspot.com

چپکائے رہی۔ کسی سے کچھ کہوں بھی کیسے۔ پرایا ملک ہے۔ ٹکٹ چیکر ادھر ادھر ٹہلتا ہوا۔ اپنا ڈیوٹی دیتا ہوا۔ یوں نظر ڈالتا کہ جیسے کہہ رہا ہو "ہور چوپو" کیا تھا جو اپنی اصل سیٹ پر چلی جاتیں۔ ادھر دیکھو۔ وہ خاتون جس نے تمہارے ساتھ سفر کرنا تھا وہ تمہاری سیٹ پر بیٹھی ٹائم میگزین پڑھ رہی ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنے ہم سفر نوجوان سے بات چیت کر لیتی ہے۔ میرے قریب میں "خرانوں" کا انجن اسٹارٹ ہو گیا تھا یا پھر بیرے کی آواز تھی۔ "ویج' نان ویج" مطلب یہ کہ صرف سبزی دال والا کھانا چاہئے یا گوشت والا'

راجد حانی میں وقفے وقفے کے بعد رام تیری گنگا میلی' بجنے لگتا تھا۔

ارے گنگا ہو' راوی ہو یا ستلج میل کچیل تو ان کا نصیب بن گئی ہے۔ کئی طرح کے دھندے کرنے والوں کے درمیان بہنے والے پوتر دھارے آخر کب تک اجلے رہتے۔ کبھی من میلا۔ کبھی تن میلا تو کبھی دھن میلا۔

صبح ہونے لگی تھی۔ جنوری کے مہینے میں بمبئی کی دوپہر اچھی خاصی گرم تھی۔ مگر جوں جوں ٹرین شمالی ہندوستان کی طرف بڑھتی گئی موسم خنک ہوتا گیا۔ ٹرین کی ایئر کنڈیشنگ ٹھنڈے سے گرم میں منتقل ہو گئی تھی۔ بیرے نے صبح کے ناشتے کے لئے آواز لگائی۔

"ویج' نان ویج"

بائیں جانب ماں بچے میں تکرار ہونے لگی۔ بچہ کہہ رہا تھا کہ وہ نان ویج ناشتہ کرے گا۔ نان ویج سے مراد انڈہ ڈبل روٹی کا ناشتہ۔ ویج چنے پوری بھجیا' ماں بیٹے کو سمجھا رہی تھی کہ تم نے کل بھی انڈہ کھایا تھا۔ آج نہ کھاؤ تو اچھا ہے۔ مگر بچہ بضد تھا۔ کہ وہ پوری بھجیا نہیں کھائے گا۔

ماں کے ماتھے پر بندیا چپکی تھی۔ بیٹا نیکر اور ٹی شرٹ پہنے تھا۔ ماں سمجھ رہی تھی بلکہ یقین رکھتی تھی۔ کہ ماس اور انڈے قسم کی چیزیں خون میں فتور بھرتی ہیں۔ معتدل مزاجی کے لئے دال سبزی کی غذا بہت مناسب ہے۔ بیٹا روٹھا روٹھا سا تھا۔ ارے نہیں ماں چھوڑ اب ایسی باتوں کو۔ انڈہ کھانے دو نا۔ سے کے ساتھ زور آزمائی کے لئے طاقت چاہئے۔ انڈے میں بڑی طاقت ہے۔

گاڑی ہریانہ اسٹیشن پر رکی تھی۔ اتنے بڑے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر آنے جانے والے مسافر بھلا کیا ہوتے۔ ڈبے میں کچھ کھلبلی ہی مچ گئی تھی۔ ہریانہ ——وہ——چنڈی گڑھ اور امرتسر میں گڑبڑ ہو رہی تھی---

حساس علاقہ۔

جب سے پوپھوٹی تھی چلتی ہوئی گاڑی کے باہر تاحد نظر پھیلے ہوئے کھلیانوں نے اپنے ملک کی وسعتوں کی گواہی دی تھی۔

---

allurdupdfnovels.blogspot.com

مارک ٹوین کو پیرس کے گائیڈ سے بڑی شکایت تھی۔ اس نے انہیں چور، جھوٹے، فریبی، دغا باز نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا تھا۔ مارک ٹوین کا تجربہ تھا کہ پیرس کے گائیڈ ہر امریکی کو بہت چکر دیتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنا چاہتے ہیں۔ دہلی کے جنتر منتر میں جنوری کی روشن دوپہر تھی۔ آڑی ترچھی، متوازی عمودی دیواریں۔ بڑے حساب کتاب لگا کر بنائی گئی کنکریٹ کی گولائیاں اور جھروکے وقت اور تاریخیں بتانے والے زاویے۔ سورج گھڑیاں۔ سائے ناپنے سے وقت کا پتہ چلانا اور یہ کہ چاند کی پہلی تاریخوں میں روشنی کہاں کہاں پہنچتی ہے اور پھر پورنماشی کی رات وہ کس کس گوشے کو جگمگاتی ہے۔

گائیڈ، میم صاحب" ایک منمناسا شخص اپنی خدمات پیش کر رہا تھا۔ ہاں کیوں نہیں۔ ٹھیک ہے یہ جانتا ہو گا —— بتا دے گا۔ اس کی بھی سن لیتے ہیں۔

انوپا —— میری دوست کی جوانسال بیٹی۔ وہ جو اسی شہر میں پیدا ہوئی تھی۔ انوپا نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔ شہر کے مرکز میں واقعہ یہ جگہ مقامی اور غیر ملکی سیاحوں سے بھری پڑی تھی۔ گائیڈ لان کے ایک کونے میں بیٹھ کر ہمیں جنتر منتر کے بارے میں بتانے لگا۔

وہ جی میم صاحب۔ میں غریب آدمی ہوں۔ عرصہ سے بیمار ہوں۔ میرے آٹھ بچے ہیں۔ کوئی کام دھندا نہیں کر سکتا۔

اچھا تو اسی لئے گائیڈ بن گئے ہو۔

جی میم صاحب۔ کیا کروں گریب (غریب) آدمی ہوں۔ ہندوستان میں غ، گ ہے۔ یعنی غالب، گالب، غفار، گفار، غیر گیر لیکن کوئی کسی کو نہیں ٹوکتا مذاق بھی نہیں اڑاتا۔ شاید اس لئے کہ سبھی ایک جیسے ہیں۔ لاہور میں گھڑے کو گھرا،

سڑک کو سرک بولنے والوں کو اچھا خاصا بدھو خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کراچی میں جب پنجابی قیامت کو کیامت کہہ دیں۔ اقبال کو اکبال کہہ دیں تو اسے ایک دم ڈھگا، بنا دیا جاتا ہے۔ پنجابی کی یہ خصوصیت ہے کہ انگریزی بڑی اچھی بول لیتا ہے۔ لیکن اس کے حلق بلکہ حلک سے ق بڑی مشکل سے نکلتا ہے۔

دہلی میں میرا گائیڈ اپنی غربت کا رونا رو رہا تھا۔ اس نے دس روپے کے عوض جنتر منتر کی تفصیلات بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ پندرہ منٹ گذر گئے تھے۔ وہ مسلسل آئیں بائیں شائیں کر رہا تھا۔ وہ یقیناً خود بھی نہیں جانتا تھا۔ بس پیسے بٹورنے کے لئے اس نے گائیڈ کا سوانگ بھر لیا تھا —— کیا کرتے رقم اسے دے کر جان چھڑائی۔

ان دنوں فہمیدہ ریاض دہلی میں تھیں۔ پاکستان کی مارشل لاء اتھارٹیز سے اس کی "آواز" برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں کراچی سے چلنے لگی تو دوستوں نے کہا کیا فہمیدہ سے ملو گی ہاں کیوں نہیں بھئی فہمیدہ دوست ہے۔ کسی نے دبے لفظوں میں یہ بھی کہہ دیا۔ احتیاط کرنا کسی مشکل میں نہ پڑ جانا۔ ارے دیکھا جائے گا کیا کر لیں گے۔ دہلی پہنچ کر فہمیدہ کو فون کیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ میں دہلی پہنچ کر اس سے ملنے آؤں گی۔ پھر اسے لے کر سڑکوں بازاروں میں گھوموں گی۔ فہمیدہ باتوں باتوں میں کہنے لگی۔ "یار بچے بہت چھوٹے تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ انہیں بے سہارا چھوڑ کر جیل چلی جاتی۔"

نرائنہ میں ایک چھوٹا سا گھر، میلی کچیل دیواریں اور فرش۔ دیار غیر کی بے آرامی۔ بے روزگاری کی بے اطمینانی، بے رحم خنک موسم کی ناآسودگی —— فہمیدہ کے گردوپیش میں یہ سب بکھرا پڑا تھا۔ لیکن وہاں صبر و استقلال کی کمی نہ تھی۔ اس انتظار کی اکتاہٹ، کہ نہ جانے کب وطن لوٹنا ممکن ہو۔ فہمیدہ ہندوستان کے اخباروں میں چھپ رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا کہ اس کی نظمیں پاکستان میں نہیں چھپ سکتی تھیں۔

"پاکستان سے آنے والے مجھ سے ملتے نہیں ہیں۔ خوفزدہ رہتے ہیں۔ کہیں

allurdupdfnovels.blogspot.com

مڈبھیڑ ہو جائے تو کترا کر نکل جاتے ہیں۔" فہمیدہ کے لہجے میں دکھ تھا۔ "پھر ایک رات۔ گھر کی گھنٹی بجی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے دہلی میں پاکستان کا ایک سفارتکار تھا۔ وہ دن کے اجالے میں مجھ سے نہیں مل سکتا تھا۔ چوروں کی طرح رات گئے ملنے آیا تھا۔ میرا پرانا فین تھا۔ میں نے اسے باہر سے ہی لوٹا دیا۔ نہیں مجھے اس سے نہیں ملنا تھا۔ نہ جانے کس نیت سے آیا ہو۔"

فہمیدہ کے گھر میں ایک ہندو عورت کام کرتی تھی۔ یہ بھی یقین نہیں تھا کہ یہ کس کی مخبر ہے۔ فہمیدہ سچ کہنے کی سزا بھگت رہی تھی۔

فہمیدہ نے جگہ بدل لی تھی۔ بہت سارے ایسے بھی تو تھے جو اپنی اپنی جگہوں پر بظاہر ٹھیک ٹھاک رہتے بستے ہوئے بھی' دن کو دن' رات کو رات اور ظلم کو ظلم' نہ کہہ سکنے کی سزا بھگت رہے تھے۔ بہرحال جلاوطنی سے اسے وہ آزادی مل گئی تھی کہ وہ مشاعروں میں' ادبی محفلوں میں سب کچھ کہہ سکتی تھی۔

ہم نے کناٹ پلیس کے امپوریمز کے سامنے تھڑے پر بیٹھ کر قہقہے بھی لگائے۔ چھابڑی والے سے کچھ لے کر کھایا۔ گپیں لگائیں۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

وہاں پر' دور دور تک کوئی ایسا نہ تھا جو چادر اوڑھنے اور چار دیواری میں چلے جانے کا حکم دیتا ہو۔

ہندوستان والے جشن منا رہے تھے۔ دہلی میں کئی طرح کی تقریبات ہو رہی تھیں۔ میرے میزبانوں نے تاکید کی تھی کہ یہ سب دیکھ لو۔ ایک روز قبل صبح سویرے پریڈ ہونے والی تھی۔ بچوں نے جگایا کہ راجیو گاندھی کو ٹیلیویژن پر دیکھ لیں۔ دہلی والے اور وہاں آنے والے بہت سے سیاح جنوری کی شدید سردی میں رات بھر سڑکوں کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ وزیراعظم کو ——— وہ جو بھی ہو۔ ایک نظر دیکھنے کے لئے۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکا تو ٹی وی پر ہی پھولوں سے لدا پھندا ہار جیسا منظر دیکھ کر خوش ہو گئی۔ پھر ایک شام تال کٹورے میں لوک رقص پیش کئے جانے والے تھے۔ ہر صوبے' ہر خطے کے رقص۔

تال کٹورا ایک بہت بڑا سا کٹورا۔ گول گنبد' جس میں ہزاروں تماشائی سما

جائیں

پنجابی بیساں ——— یعنی سکھنیاں۔

ڈھاکہ کا رہنے والا ایک دھوبی کسی کے گھر دھلائی کے کپڑے لینے گیا۔ کپڑے گن رہا تھا کہ چار پتلونیں' پانچ بنیانیں' دو دھوتیاں۔ اور چار پنجابی۔ مطلب یہ کہ شلواریں۔

ہندوستان میں سکھوں کو پنجابی کہتے ہیں۔

لہلہاتی سبز نیلی' گلابی' زرد ساٹن کی قمیضیں شلواریں پہنے گدا' ڈالتیں پنجابنوں نے خوب مزہ کیا۔ ایسے جیسے کھیتوں میں سرسوں کی ڈالیاں لہراتی ہیں۔ تیز ہوا چلے تو جیسے بر سیم جھوم جھوم کر نہال ہو جاتی ہے۔ آسام کے رقاصوں نے ڈھول کی تھاپ پر سماں باندھ دیا۔ ناگالینڈ کے رقص میں جنگ جوئی تھی۔ جبکہ تامل ناڈو کے ہاں یہ اصرار تھا کہ ہمیں پہچانو ہمارے فن کا اقرار کرو۔ تامل ناڈو کا سیوائی آتم ——— رقاص اور مغنیوں پر مشتمل ایک گروپ۔ اروی' بانسی اور گونگ بجاتے' ڈھولکی تھاپ پر' رقاصوں نے موروں کے پروں کو کمر سے باندھ رکھا تھا۔ بھگوان اور دیوتاؤں کی مدح سرائی۔ تامل ناڈو کے دیہات کے لوک میلوں کی تفریح اپنے علاقے کی نمائندگی۔ سیوائی آتم تامل ناڈو کا بہت قدیم رقص ہے۔ اپنے ماحول میں رچے بسے' باہر کی دنیا اور اس کی وسعتوں سے بے خبر انسان کی تخلیق۔ اس کے جذبات و احساسات کا اظہار۔ اپنی سرزمین پر فطرت کی فیاضی کا اعتراف' گلابی دھوتی' سرخ قمیض' بھوری پگڑی' رقاصوں کی سرخوشی میں یہ رنگ آمیزی بھلی لگ رہی تھی۔ میرے قریب امرتسر کے دو سکھ میاں بیوی بیٹھے تھے۔ میں اس وقت الٹے کٹورے کے پیندے کے نیچے تال پر رقص کرتے ہوئے' اپنے اپنے علاقوں اور صوبوں کے رنگ ڈھنگ بتاتے' لوک فن کاروں کو کیمرے میں محفوظ کرنے میں مشغول تھی۔ سردار جی نے بڑی محبت سے حال چال پوچھا۔ پھر سردارنی جی بھی پنجابی ملی ہندوستانی میں بات کرنے لگیں۔ ان کا اصرار تھا کہ مجھے امرتسر ضرور جانا چاہئے سیدھے سادے لوگ۔ ہر طرح کے تکلف سے دور بھلے سے یہی پوچھو۔ کتھوں آیئے او (کہاں سے آئے ہو) کتھے جاناں اے

allurdupdfnovels.blogspot.com

(کہاں جانا ہے) دلی وچ کدے کول ٹھہرے او (دلی میں کس کے ہاں ٹھہرے ہو) کم ازکم باہر سے آنے والے کو یہ تو نہ لگے کہ ساتھ والی نشست پر ایک سور بندھا ہے جو نہ بات کرتا ہے۔ نہ کچھ سنتا ہے محض "سوکتا ہے" میرے ساتھ بمبئی سے دلی آنے والا مسافر بھی ایسا ہی تھا۔

ہندوستان میں سوروں کو باندھ کر نہیں رکھا جاتا وہ گلی کوچوں میں اس طرح گھومتے رہتے ہیں اور جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر میں منہ مارتے نظر آتے ہیں جیسے ہمارے ہاں وہ کتے اور بلیاں جنہوں نے ابھی تک کارپوریشن کی گولی نہ نگلی ہو۔

میں دلی میں اپنی ایک پرانی دوست کے ہاں مقیم تھی۔ پنجابی کرسچن۔ مارے محبت کے پنجابی ہندو سے شادی کرلی۔ کراچی چھوڑ کر دلی جا بسیں۔ میں ایک روز دن بھر کے بعد گھر پہنچی تو انوپا (میری دوست کی بیٹی) نے پوچھا کہ آج آپ نے دوپہر کو کیا کھایا تھا؟۔

"میں نے کناٹ پلیس میں ایک ریسٹوران سے برگر کھالیا تھا"

انوپا میری بات سن کر اچھل پڑی۔ "ویری گڈ آج تو آپ نے پورک کھا ہی لیا"

"کیوں؟"

"آپ کے آنے سے دو روز پہلے ماما نے فرج میں سے تمام پورک پھینکوا دیا اور ہمیں حکم ملا تھا کہ جب تک آنٹی یہاں رہے گی۔ اس گھر میں پورک نہیں آئے گا۔

"ماما ——— دیکھ لیں ———" اس نے ماں کو آواز دی ——— آج آنٹی نے

ارے بابا میری بھی تو سنو ——— میں نے اس کی بات کاٹی ——— "میں نے آلو کا برگر کھایا تھا" اور انوپا کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

وہاں کچھ چیزیں 'کڑوی' کسیلی' تکلیف دہ باتیں' مذاق کے روپ میں ایک دوسرے کو سنا دی جاتی تھیں۔ مثلاً ایک روز گھر میں کچھ مہمان آئے میں ان سے ملی۔ ایک صاحب کا تعلق بھارتی فضائیہ سے تھا۔ اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ بتایا گیا۔

"یہ وجے انکل ہیں" ہیلو جی۔ نمشکار ارے آپ نے ضرور میرے ملک پر بمباری کی ہوگی۔

وجے انکل ہنس دیئے۔ سب ہنسنے لگے۔

یا پھر کبھی مجھ سے یہ کہا گیا۔ ہندوستان میں تو کافر رہتے ہیں۔ آپ کیسے یہاں آگئیں۔

کیوں نہیں۔ ارے بھئی کافروں سے بھی تو ملنا چاہئے۔"

ہندو گھرانوں میں رسوئی (باورچی خانہ) بہت پوتر جگہ ہوتی ہے۔ برہمن' کھتری کی رسوئی میں کوئی شودر چلا جائے تو وہ بڑشت ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی برہمنوں' کھتریوں کی نظر میں جو برہمن اور کھتری نہیں ہوتا وہ شودر ہی ہوتا ہے۔ بھلے سے وہ عیسائی ہو' مسلمان یا کوئی اور مجھے پیاس لگی تھی۔ جے شری' میری دوست کا ہندوانہ نام۔ کھانا پکا رہی تھی "میں تمہاری رسوئی میں آجاؤں۔ کچھ ہرج تو نہیں۔" میں نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔"

لالہ جی نے اخبار پڑھتے پڑھتے میری آواز سن کر نظر اٹھائی اور مسکرا کر دوبارہ اخبار پڑھنے لگے۔

میری دوست کا سولہ سالہ بیٹا سندیپ کبھی ہاکی اور کبھی کرکٹ پر میرے ساتھ بحث کرتا تھا۔ اس کا باپ ہمیشہ سے امریکی فرم میں ملازم ہے۔ لیکن سندیپ مجھے کہتا۔ آنٹی آپ کے ملک کی خوشحالی امریکہ سے آئی ہے۔

میں کہتی۔ تم ٹھیک کہتے ہو جس لابی میں امریکہ ہوتا ہے۔ وہاں روس نہیں ہوتا۔

یہ سن 86 کا ذکر ہے۔ روس میں اگلے چند برسوں میں کیا ہونے والا ہے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ بہرحال امریکی امداد' کا طعنہ دے کر شرمندہ کرنا' بھی محض ایک تفریح تھی۔ میں اس بحث برائے بحث' کو بڑھانے کی خواہش لئے سوہنو سے کہتی دیکھو ہمارے بہت سے بچے امریکہ پڑھنے جاتے ہیں۔ واپسی پر امریکی کیسٹس' جوگرز اور جینز لیتے آتے ہیں میں نے کہا نا۔ امریکہ ہمارے ہاں محض مالی امداد سے ہی نہیں اور بڑے طریقوں سے آیا ہے۔ پھر ہم فاسٹ فوڈ کے شوقین ہو

allurdupdfnovels.blogspot.com

گئے۔ یہی نہیں ہم وہائٹ ہاؤس کے آرکیٹیکچر سے بھی مرعوب ہیں۔ ہمارے اونچے طبقے کے' بہت پیسے والے' اپنے ٹھاٹ باٹھ کی آواز اونچی کرنے کا پروگرام بناتے ہیں تو وہائٹ ہاؤس جیسا گھر بنا کر سمجھتے ہیں کہ جیسے اس کے اندر امریکی صدر رہ رہا ہو۔

اس وقت تک پورے ہندوستان میں ایک بھی "وہائٹ ہاؤس" نہ تھا۔ میں اور جسمین (جے شری) بس میں کہیں جا رہے تھے۔ جسمین نے کچھ مکانوں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ تمام گھر پارلیمانی ارکان کے ہیں۔

اتنے بڑے ملک' اتنی مستحکم جمہوری حکومت کے پارلیمانی ارکان کے گھر۔!! جھوٹ نہ بولو۔ اس سے اچھے تو ہمارے ہاں کے چھوٹے چھوٹے ضلعوں کے ڈپٹی کمشنروں اور تحصیل داروں کے گھر ہوتے ہیں۔ ٹھاٹ باٹھ اسی طرح ہماری گھٹی میں پڑ گیا ہے۔ جس طرح کنجوسی تمہارے خون میں رچ بس گئی ہے۔ ہم ایک روپیہ کماتے ہیں۔ اور پانچ روپے خرچنے کے پروگرام بناتے ہیں۔ باقی کے چار روپے حاصل کرنے کے لئے بس نہ پوچھو کیا کچھ کرتے ہیں۔ رشوت' اسمگلنگ' ریاکاری' یہ سب کچھ تمہارے ملک میں بھی ہوتا ہو گا۔ لیکن اپنی اپنی عادت ہے۔ بقول نرود اس چوہدری کے ہندو کی پیسہ جمع کرنے کی عادت کی تہہ میں دراصل یہ مقولہ' بلکہ کلیدان کارفرما ہے کہ تمہیں اپنی آمدنی کے ایک چوتھائی سے زیادہ خرچنے کی اجازت نہیں۔ تم اس سے زیادہ کے مستحق نہیں ہو۔' گویا باقی کا تین چوتھائی —— پرانے وقتوں میں تجوری میں جاتا تھا —— اب بینک میں ہوتا ہے نرود چوہدری کلکتہ کے براڈ کاسٹر اور کالم نویس ہیں۔ بقول ان کے ہم اپنے آپ پر آرام و آسائشیں حرام کر لیتے ہیں۔ مغربی تصور کے مطابق معیار زندگی بڑھانے کے حق میں بھی نہیں۔ تاکہ ہم مرتے وقت اپنے پیچھے دھن دولت چھوڑ سکیں اور ہماری آئندہ نسلیں غربت میں آنکھ نہ کھولیں۔ اور ہمارے بعد آنے والے بچوں کے لئے کسی نہ کسی صورت میں وراثت کو یقینی بنایا جا سکے۔ ایک ویلفیئر اسٹیٹ قائم کرنے کا ہمارے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے۔

سوتی ساریاں' کھادی کے کرتے پاجامے۔ نجی گاڑیاں تعداد میں کم۔ عوامی

ٹرانسپورٹ کا استعمال زیادہ۔ چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں بنی ترکاریاں' دال' پاپڑ۔ دہلی کی بود و باش

ریشمی' چینی جاپانی ملبوسات' زرق برق بڑی بڑی بوتیکس پر تیار ہونے والے مہنگے کپڑوں کی مانگ۔ بہت ساری گاڑیاں۔ نئی نئی گاڑیاں فاسٹ فوڈ۔ بڑے بڑے ڈونگوں اور طشتریوں میں سجے تر پکوان چرغے' رانیں' قورمے' بریانیاں گاڑیوں میں مہنگے کیسٹ پلیئرز پر امریکی فاسٹ بیٹین' بجانے کا شوق۔ فرانسیسی خوشبوؤں سے آراستہ ڈریسنگ ٹیبل'

ایک روپیہ کما کر پانچ روپے کی شاہ خرچی

میں جن پت پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ شام کے 8 بجے تھے۔ دفتر بند ہونے کے اوقات' ایک بس آتی۔ "لیڈیز اسپیشل" واہ بھئی دہلی والوں نے تو یہ مثال قائم کر دی۔ میں نے اب تک اپنے ملک سے باہر کی جو دنیا دیکھی تھی مجھے اس قسم کی بس نظر نہ آئی تھی۔ ہمارے ملک میں اس زمانے میں عورت ذات پر بہت کرمفرمائیاں ہو رہی تھیں۔ عورتوں کے لئے الگ یونیورسٹی بناؤ۔ عورتوں کو چادر اڑھاؤ۔ عورتوں کو چار دیواری کے پیچھے پھینکو۔

یہ سب شہری عورت کے لئے تھا۔

کھیتوں میں کام کرنے والی عورت بے ضرر ہے۔ اس کی پروا نہ کرو۔ شہر میں رہنے والی عورت بہت کھلتی ہے۔ نہ نہ شہری عورت اچھی بہت لگتی ہے۔ لیکن کام کرتی ہوئی' اپنا حق مانگتی ہوئی' اچھی نہیں لگتی۔ اس لئے اس کے تقدس' کو کسی ڈبے میں بند کر کے رکھ دو۔ پھر اسے کہو کہ اگر وہ کسی کام سے باہر نکلنا چاہتی ہے تو پچاس سیٹوں والی بس میں چڑھے ہوئے ڈیڑھ سو مردوں کے ساتھ کھیتی' ہوئی سفر کرے یہ اس کی اپنی مرضی ہے' ہم تو چاہتے ہیں کہ وہ اپنا گھر بار سنبھالے۔ خواتین کے لئے خصوصی بسیں چلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بس اسٹاپ کے قریب ایک سکوٹر والا ہندوستان میں موٹر رکشا کو سکوٹر ہی کہتے ہیں۔ سکوٹر روکے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس اخبار پر کسی فلمی اداکارہ کی نیم عریاں تصویر نہ تھی کہ وہ محض آنکھیں سینکنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی ان لوگوں کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

آنکھیں سیر ہیں۔ وہ ایسے چھوٹے موٹے نظاروں کے لئے ترستے نہیں ہیں۔ سکونڈ ڈرائیور بڑے انہماک سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ کسی سیاسی پارٹی کا اخبار تھا۔

میم صاحب آپ کو کہاں جانا ہے۔؟ اسکونڈ ڈرائیور کا سوال تھا۔

ہندوستان میں بیگم صاحب' کہیں نہیں ہوتیں۔ وہاں شریمتی جی ہیں یا دیوی جی ہیں۔ کہیں کہیں بہن جی' بھی ہوتی ہیں۔ لیکن کسی شک کی گنجائش ہو۔ کوئی عورت یہ سب کچھ معلوم نہ ہوتی ہو تو پھر وہ میم صاحب ہوتی ہے ویسے بھی وہاں ٹورسٹ بہت آتے ہیں۔ اور ان میں اصلی میمیں بھی ہوتی ہیں۔ اس لئے بھی یہ لفظ عوامی ہو گیا ہے۔

مجھے ہندوستان آئے ہوئے دس روز ہو گئے تھے۔ مجھے اس سرزمین کے ساتھ یگانگت پیدا کرنے اور اس کے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی۔ بمبئی میں تھی تو اس کا موسم' اس کا نسلی تنوع اور لسانی رنگا رنگی پر وہ مجھے کراچی جیسا لگنے لگا تھا۔ اور اب دہلی! ——— لاہور کو انلارج کر دو اور اس میں کچھ اور رنگ بھر دو تو وہ دہلی بن جائے گا۔

میں کچھ دیر پہلے وجے پارک میں لکڑی کی ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ جنوری کی شام خاصی ٹھٹھری ہوئی تھی۔ اس روز ری پبلک ڈے کے سلسلے میں بیٹ آف ریڈیٹ' کا پروگرام ہونے والا تھا۔ فتح کے بعد فوجوں کی واپسی۔ جشن کے بعد۔ جشن کو لپیٹنے کی رسم۔ جیسے عید کے بعد نرو۔

ہاتھیوں' گھوڑوں' بگلوں کا ہجوم ——— مارشل ٹیونز' بے شمار تماشائی تصویریں اترواتے' ادھر ادھر بھاگتے پھرتے' آلو کے چپس اور بھنے ہوئے چنے کھاتے بچے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھی نظارہ دیکھتی رہی پھر بے سبب اٹھ کر چل دی۔ ویسے بھی وجے پارک میں بجنے والی فوجی دھنیں مجھے سنی سنائی لگ رہی تھیں۔ ہم لوگ برسوں سے یہ دھنیں سن رہے تھے۔ سایہ دار' اونچے' گھنے اور تن آور درختوں کے نیچے سے گذرتے ہوئے میں دور تک نکل گئی۔ کتابوں کی نمائش کا بورڈ پڑھا۔ اس طرف مڑی۔ تہہ خانے میں نمائش لگی تھی۔ سستی' مہنگی' ملکی غیر ملکی کتابوں کا میلہ ——— میرے ساتھ ——— انجانے لوگوں میں خود کو کھو دینے کا

شوق۔ اپنا سراپا۔ نہ کوئی مجھ سے بات کرے اور نہ میں کسی سے بات کروں گی۔ ورنہ میرا تجسس ٹوٹ جائے گا۔ اور میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ بری عادت۔ ہاں ہے یہ بری عادت ہی سہی۔ باہر نکلی۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ ایک چھوٹا سا چائے خانہ نظر آیا۔ چائے پی اور پھر بیگ کندھے پر ڈال کر بس اسٹاپ کی طرف چلدی۔

میں دہلی میں روزانہ کناٹ پلیس' منڈی ہاؤس یا جن پت سے گل موہر جانے کے لئے بس لیتی تھی۔ جس طرح بمبئی میں لوکل ریل گاڑیوں کا سسٹم بہت عمدہ ہے اسی طرح دہلی میں بسوں کا نظام بہت باقاعدہ اور جدید ہے۔ مگر سکوں کی قلت پریشان کر دیتی ہے۔ دوکاندار سے سودا لینے لگی۔ ریزگاری نہ ہو تو وہ سودا دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اسی طرح بسوں میں سفر کرنے کے لئے پہلے سکوں کا انتظام ضروری ہے اس روز میرے پاس سکے نہ تھے۔ میں نوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی کہ پانچ روپے کا ہے یا دس روپے کا۔

آواز آئی ——— آپ کہاں سے آئی ہیں؟

او' ہاں۔ میں پاکستان سے ...."

میں دیکھ رہی تھی کہ آپ نوٹ کو الٹ پلٹ رہی تھیں۔"

وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ دفتر سے چھٹی کے بعد گھر جا رہی تھی۔ حوض خاص ——— اچھا ہاں۔ وہاں امرتا پریتم بھی رہتی ہیں۔ میں پاکستان سے چلی تھی تو سوچا تھا قرۃ العین حیدر اور امرتا پریتم سے ضرور مل کر آؤں گی۔ میں نے کسی نہ کسی طور دونوں خواتین کے فون نمبر بھی حاصل کر لئے تھے۔ مگر کسی نے کہا کہ قرۃ العین حیدر سے ملاقات مشکل ہے۔ وہ لفٹ نہیں دیتیں۔ اچھا۔ کوشش کروں گی۔ نہیں تو نہ سہی۔ امرتا پریتم سے فون پر بات ہوئی تھی۔ ان کے لہجے میں بھی کوئی خاص تپاک نہ تھا۔ لیکن حوصلہ شکنی بھی نہ تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آواز میں جواب ملا تھا کہ "ضرور آئیں۔ مگر پہلے فون کر لیں۔"

میں نے دہلی آتے ہی یہ پروگرام بنانا شروع کر دیا تھا کہ یہاں سے اب کہاں جانا ہے۔ ٹورسٹ انفارمیشن کے دفتر میں نقشے اور پمفلٹ بنا رہے تھے کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہاں بہت کچھ دیکھنے کو ہے۔ ارے تم تو چند روز' چند ہفتوں کے لئے یہاں آئی ہو۔ البیرونی پندرہ سال تک ادھر رہا۔ لیکن خیر وہ اس کا زمانہ تھا۔ اسے ہندوستان کے بارے میں کچھ ایسی باتیں معلوم کرنی تھیں جو اس وقت تک جانی نہ جا سکی تھیں۔ ملک کی وسعتیں' اس کے طول و عرض البیرونی کے کئی سو برس بعد جانے والے اس مسافر کی خواہش تو جانی پہچانی باتوں کے عصری روپ کو دیکھنا تھا۔ میں نے دہلی کے اردگرد اہم مقامات کی کھوج میں —— ہر دوار پر نشان لگا دیا۔ مجھے بتایا گیا —— پہلے بھی اندازہ تھا کہ یہ ہندوؤں کی بہت مقدس جگہ ہے۔ یہاں جانے والے یاتری زیادہ تر آشرم میں ٹھہرتے ہیں۔ کوئی بھی جائے کچھ روک ٹوک نہیں۔ ارے بھئی اگر یہ جان پڑ گیا کہ یہ ہندو نہیں تو کہیں پنڈت جی مجھے وہاں سے نکال نہ دیں۔ نہیں۔ وہ جگہ ہی ایسی ہوتی ہے۔ گاندھی جی کے ساتھ باچا خان بھی تو آشرم میں ٹھہر جاتے تھے۔

تم ہر دوار جاؤ تو ایک بوتل گنگا جل سے بھر لانا۔" جے شری کی ساس کی فرمائش تھی۔

"جی ماتا جی ضرور" میں نے یقین دلایا میں آشرم میں رہنے کے ایڈونچر سے بہت خوش ہو رہی تھی۔ خوب مزہ آئے گا۔ ایسی جگہوں پر جا کر۔ سب کے ساتھ رہ کر ہی تو وہاں کے لوگوں کو ٹھیک سے جاننے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن سنو۔ وہاں ہوٹل بھی تو ہوں گے۔ ارادہ ڈانواڈول ہو رہا تھا۔

سندیپ نے میری اور دادی کی گفتگو سن لی تھی وہ میرے کمرے میں آیا۔ کہنے لگا۔ وہ آپ ماتا جی کی بات کی پرواہ نہ کریں۔ انہیں ابھی ابھی یرقان ہوا ہے۔ آپ کو پتہ نہیں کہ وہ پانی کس قدر غلیظ ہوتا ہے۔ اس میں کتنی بیماریاں ہوتی ہیں۔ میں سندیپ کو غور سے سن رہی تھی۔

بیسویں صدی کا جدید ذہن رکھنے والا بچہ توہم پرستی سے باہر نکل آیا تھا

ہندوستان میں ہر علاقے کے اپنے اپنے دیوتا ہیں بمبئی میں شیو کا بہت ٹھکا' ہے۔ شمالی ہندوستان کی طرف آتے آتے کرشن بھگوان کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔

لیکن سوہنو کہنے لگا۔ مجھے کرشن پسند نہیں ہے وہ کبھی میرا ہیرو نہیں تھا۔ وہ بہت زیادہ عورت پسند تھا۔ مجھے تو رام پسند ہے۔

ہر جگہ کے اپنے اپنے کلٹ اور عقیدے۔ اسی طرح کہ کوئی داتا گنج بخش کا پیرو ہو جائے۔ لاہور سے چلو تو پاکپتن میں بابا فرید شکر گنج کی فیض رسانی کا چرچا زیادہ سنائی دے گا آگے چلیں تو راستے میں ملتان کے خواجہ رکن الدین اور پھر سندھ میں شاہ لطیف' بھٹ سرمست' شہباز قلندر ہوں گے —— کہیں خانقاہیں اور درگاہیں بن گئیں۔ تو کہیں مندر اور مورتیاں۔ جب انسان آپس میں ایک دوسرے کی باتیں سمجھنا چھوڑ دیں۔ دل کی بات کہنے والا کوئی نہ ملے۔ کوئی جگہ ایسی نظر نہ آئے جس کے سناٹے میں ڈوب کر اپنے اندر کی بے چینی ہلکی ہو سکے تو پھر ایسی جگہوں پر جانے والے بہت ملیں گے' اپنی تمنائیں دلوں میں چھپائے۔ اپنے کتھارسیس کی خاطر۔ محرومیوں سے خالی ہونے والے من کی تاریکی دور کرنے کے لئے۔

پروگرام یہ بنا کہ آج پرانی دلی دیکھی جائے۔ آج بھی گل موہر سے نکلے تو ہمایوں کا مقبرہ راستے میں تھا۔ میں ہر روز اسے دیکھتی۔ آتے جاتے۔ لیکن یہ خواہش نہ ہوئی کہ اتروں اور یہ مقام بھی دیکھ لوں نہ ہی وہاں زیادہ چہل پہل ہوتی۔ وہاں عجب طرح کی ویرانی چھائی رہتی تھی۔ جیسے لاہور میں ملکہ نورجہاں کے مقبرے پر۔ سوائے اس کے کہ ہمایوں کے مقبرے کی عمارت میں وہ توڑ پھوڑ نہیں ہے۔ وہاں کبھی کوئی فقیر۔ کوئی مست حال شخص بیٹھا نظر آ جاتا۔ دھن والے لوگ آئیں تو مانگنے والے بھی ہوں۔

میری دوست جو میری میزبان تھی اس کے آباؤ اجداد مسلمان تھے۔ نانا نانی چل بسے تو ماموؤں سے چھوٹی بچی (میرے دوست کی ماں) پالی نہ جا سکی اور اسے عیسائی مشنریوں کے سپرد کر دیا۔ اس طرح وہ عیسائی بنی۔ بڑی ہوئی تو ہندو سے دل لگا لیا اور دلی جا بسی۔ لیکن اسے پاکستان اب بھی اپنا میکہ لگتا ہے۔ میں جاتے ہوئے اس کے لئے خشک میوہ لیتی گئی تھی۔ اگلی صبح اس نے وہ میوہ کٹوریوں میں سجا کر پڑوسیوں کے ہاں بھیجا۔ اپنی مدراسی نوکرانی سے کہنے لگی۔ کہنا گاؤں سے آیا

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہاں کے لوگوں کی صورتیں۔ نہ بود و باش' نہ تعمیرات۔ یہ سب کچھ جو سامنے تھا۔ احاطہ نظر میں تھا۔ وہ تو بہت بعد میں ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ بنتا اور بگڑتا رہا۔ یہ جو کبھی بادشاہت کا مرکز تھا۔ اب یہ محض سیاحوں کی تفریح گاہ ہے۔ برصغیر کے تاریخی شکوہ کی علامت ہے۔ لق و دق باغات' راہداریاں' جھروکے' چبوترے' پتھروں میں تراشی ہوئی پھول پتیاں' گنبد اور محرابیں اور جالیاں وہ ایک شخص جو بالکونی پھلانگ کر قلعے کی عمارت کی بیرونی منڈیر پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا —— وہ ایک امریکی سیاح تھا۔ بالکونی میں کھڑی' بڑے گھیر والی قمیض اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ایک لڑکی دوربین دیکھ رہی تھی یہ بھی شاہزادی نہ تھی۔ وہ اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ محض سیر و تفریح کے لئے آئی تھی

گنگا کبھی لال قلعے کے پہلو میں بہتی تھی۔ اب اس نے اپنا پاٹ بدل لیا ہے۔ وقت جو بدلا تو اس نے بھی رخ موڑا۔ اب وہ نئے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی سمادھیوں کے قرب میں بہتی ہے۔ یہ کیا۔! غالب کے اشعار۔ دیوار پر آویزاں ایک فریم۔ اس کے نیچے لکھا ہے "درباری شاعر" بہت زیادتی ہے۔ فریم میں سے غالب کی تصویر غائب تھی۔ کسی اور کو بھی یہ بات اچھی نہ لگی تھی۔ غالب درباری ہی تو نہ تھا نہ جانے یہ شرارت کس کی تھی۔ قلعے کے بھتہ بازار میں نسل در نسل آنے والے کاریگر۔ سیاحوں کے لئے سوونیئر بنانے والے۔ اپنے کام میں مصروف خریداروں کا انتظار کرتے' کسی کو آتے ہوئے دیکھ کر متوجہ ہونے والے۔ صدیوں پرانی ثقافت کو محفوظ رکھنے والوں کا کاروبار۔ ان کا روزگار چلو اچھا ہوا۔ اگر یہاں کوئی پارلس کی دوکانیں کھول لیتا تو بہت برا ہوتا۔ سارے میں گھوم کر میں اور جیسو —— لان میں پڑے لکڑی کے بنچوں پر آ بیٹھی تھیں —— دائیں جانب ایک خاموش مختصر اور سادہ سی مسجد۔ اورنگ زیب کی موتی مسجد۔ اس کا گوشہ عافیت۔ مسجد کا موذن نلکے پر وضو کرنے کے بعد لال سفید چار خانے والے صافے سے اپنی داڑھی خشک کر رہا تھا۔ ظہر کی اذان دینے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے جیسو سے کہا کہ تم یہیں بیٹھو میں ذرا پوسٹ آفس میں خط ڈال آؤں۔ مجھے کچھ ٹکٹ اور لفافے بھی درکار تھے۔ دو مرد اور دو لڑکیاں ڈیوٹی پر تھے۔ آواز آئی "کہتا ہے

ہے۔ اس نے مجھ سے کہا آج پرانی دہلی میں مسلمانوں کی دوکانوں سے پسندے اور رومالی روٹی کھا کر آئیں گے

پرانی دلی کا مشہور' تاریخی چاندنی چوک۔ ساروں کی بے شمار دکانیں —— اور پاکستانی کرنسی کو ہندوستانی کرنسی میں تبدیل کرنے والے دلال ——

"جی میم صاحب' کوئی سونے کا زیور' بندے' چوڑیاں"

"نہیں بھائی نہیں۔ دیکھتے نہیں ہو۔ سونے کی چوڑیاں یا کڑے تو کیا۔ کانچ کی چوڑی تک نہیں ہاتھ میں" وہ مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔

چاندنی چوک کی دوکانوں میں چند ایک برقعہ پوش' ادھ کھلے چہرے۔ بھاؤ تاؤ کرتی ہوئی۔ مسلمان عورتیں۔ وہاں کوئی ایسی لڑکی نظر نہ آئی جو گلے میں پرس ڈالے کسی بس اسٹاپ پر کھڑی ہو۔ یا کوئی سودا سلف خریدنے نکلی ہو۔ پرانی دلی کے مسلمان گھرانوں کی عزت دار لڑکیاں۔ بس گھروں میں رہتی ہیں۔ کچھ پرائیویٹ امتحان پاس کر کے پاکستان سے آنے والے رشتے داروں میں اپنا بر تلاش کرتی ہیں۔ کوئی مل جائے تو اچھا۔ ورنہ زندگی ایسے ہی گذرتی جاتی ہے۔

فہمیدہ ریاض کی ایک نوعمر مسلمان دوست اردو میں افسانے لکھنے والی۔ اخباروں میں کام کرنے والی۔ گھر سے نکلتی تو ساری پہن کر بندیا لگا لیتی کہ لوگ اسے ہندو ہی سمجھیں۔ لیکن ایسے بہت کم۔ خال خال۔ ورنہ اپنی پہچان برقرار رکھنے کے لئے جیسے وقانوسیت' اپنانا ضروری ہے۔

جامعہ مسجد کی سیڑھیوں پر چادریں لپیٹے۔ برقعے پہنے کچھ عورتیں اور دھوپ میں سستائی ہوئی چار بکریاں۔ ان عورتوں اور بکریوں کے چہرے کی قدر مشترک۔ جبر' حلمی' نرم خوئی۔ ان کے ساتھ دو مرد بھی تھے۔ ڈھیلی پتلونوں پر کوٹ اور گلے میں مفلر۔ تصویر اتروائیں۔ تھیلوں میں سے کچھ نکال کر کھایا۔ کہاں سے آئے تھے۔! شاید پاکستان سے اپنے رشتے داروں سے ملنے۔ یہی کافی ہے بھلا اس سے آگے کیا جائیں گے۔

لال قلعے کے دیوان خاص میں چبوترے پر پڑا تخت خالی تھا۔ کب سے —— ایسے ہی ہے۔ بابر ہندوستان آیا تھا تو اسے ہندوستان زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔ نہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

کمپیوٹر لگاؤں گا" ایں ——!! میں حیرت سے ان کی آزادئ گفتار کو محسوس کر رہی تھی۔ وہ' پوسٹ آفس کے رفقائے کار اپنے وزیراعظم پر تنقید کر رہے تھے۔ وہ اس کا حق رکھتے تھے۔ میری گھٹی ہوئی روح کے لئے وہ سب تازہ ہوا جیسا تھا۔ برسوں گذر گئے تھے' ڈرتے ڈرتے۔ ڈرے ہوئے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے۔ پوسٹ آفس میں بیٹھی ہوئی لڑکی کا حاکم وقت سے مطالبہ تھا کہ پہلے پیٹ بھر کر روٹی دو۔ پھر کمپیوٹر لگانا۔ ممکن ہے اس بات کا جواب ہو تا کہ کمپیوٹر لگا کر ہی تو اس دور میں روٹی ملتی ہے۔ روزگار کے وسیلے بنتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ' خطوں پر مہریں لگاتے۔ رجسٹروں میں اندراج کرتے۔ ڈاک کے ٹکٹ فروخت کرتے ہوئے۔ بڑی سمجھ بوجھ والے لگ رہے تھے ان کا سیاسی شعور زندہ تھا۔ جمہوری روایات مستحکم تھیں مجھے اس بات کا احساس بسوں میں سفر کرتے ہوئے بازاروں میں اور عوامی جگہوں پر بار بار احساس ہوا تھا۔ کبھی کبھار اپنے زمانے سے خفگی کا اظہار بھی دیکھا۔ میں نے یوسف سرائے سے کناٹ پلیس جانے کے لئے بس لی تھی۔ دو بڑی بوڑھیاں' پنجابی تھیں۔ ہندو نہیں سکھ۔ وہ بس میں سفر کے دوران اس طرح ایک دوسرے کو اپنا دکھ سکھ بیان کر رہی تھیں جیسے اپنے محلے کی گلی میں اپنے گھروں کے سامنے تھڑے پر بیٹھی ہوں۔ آواز آئی۔ اس سے اچھا تو انگریز کا زمانہ تھا۔ زیور تا پہن کر کہیں بھی چلے جاؤ کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔" ایک بار ایک انگریز وائسرائے کی بیوی نے برطانیہ میں مقیم اپنی بہن کو خط میں لکھا تھا کہ ہم لوگ لکھنؤ کے نواب کے مہمان تھے۔ انہوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بہت سے دیگر نذرانوں اور تحائف کے علاوہ انہوں نے ہمارے کتے کو سونے کے کڑے پہنائے تھے۔

یہ برصغیر کے آبادکار کا لہجہ تھا۔

دو عمر رسیدہ پنجابی عورتوں کا شکوہ!!۔ پلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا۔

انوپا نے دہلی میں میری گائیڈ کا منصب سنبھال لیا تھا۔ اور وہ مجھے لے کر منڈی ہاؤس چل دی۔ منڈی ہاؤس کا نام سن کر بہت سی منڈیاں ذہن میں گھوم

گئیں۔ گوشت پوست کی۔ دھن دولت کی۔ لال ہری بتیوں والے گنجان آباد محلوں کا خیال آیا۔ دراصل وہ ایک وسیع علاقے کا نام ہے۔ جہاں گیلریاں' آڈیٹوریم' میوزیم اور ایسی ہی بہت سی جگہیں ہیں' جہاں رات گئے بس اسٹاپوں پر بقول میری دوست کے سب سرپھرے نظر آتے ہیں۔ مصور' ڈرامہ نویس' کوریوگرافر' اداکار اس وقت کاروبار کرنے والے اپنے اپنے گھروں میں بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس روز ٹریونی کلا گیلری' آرٹ ہیریٹیج اور شری دھرانی گیلری میں صبح سے شام ہو گئی۔ اپنے آپ میں' ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیاں ٹی ہاؤس' لان کے کونے میں گیلری کی سیڑھیوں پر بیٹھے سرگوشیاں کرتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کسی موضوع پر الجھتے ایک دوسرے کو سمجھاتے۔ اختلاف کرتے۔ اتفاق کرتے۔

شری دھرانی گیلری میں سروج پال گوگی کی تصاویر کی نمائش لگی تھی۔ گوگی کراچی آئیں ان کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ ایک دوست نے اتہ پتہ دیا کہ دہلی جا کر گوگی کے ضرور مل لینا۔ لو یہ تو بہت آسان ہو گیا۔ گوگی سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور اس کی نئی تصویریں بھی دیکھ لوں گی۔ تصویریں تھیں۔ گوگی نہ تھی۔ فطری طور پر۔ ورنہ گوگی جب تصویر بناتی ہے تو وہ اپنا آپ نہیں بھلاتی۔ وہ ہر تصویر میں موجود ہوتی ہے۔ عورت کا دکھ' اس کی محرومیاں۔ عورت جو ماں ہے۔ معروضی کیفیت لیکن یہ سب کچھ تو سانجھا ہے۔ تیسری دنیا کی عورت' پوری دنیا کی عورت۔ اپنے اپنے طور پر ایسے مراحل سے گذرتی رہی ہے۔ گوگی فیمنسٹ ہے۔ وہاں درگا' کالی ماتا' رادھا' پاربتی' —— اب اپنے وقت کا روپ دھار چکی ہیں۔ ہندوستان کے بیشتر مصوروں پر "مائی تھولوجی" کی اسیری کا الزام آتا ہے۔ بھئی چھوڑو۔ اب کوئی اور بات کرو۔ بہت ہو چکیں گوپیوں کی باتیں' بہت ہو لیں۔ اب مزدور کی بات کرو۔ درباروں کے چنگل سے نکل کر گلیوں محلوں میں نکل آؤ۔ ایسا ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان کا پینٹر جو اپنی دیومالاؤں میں اسی طرح سرگرداں ہے۔ ان سے لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ جے پوری مصوروں نے میڈونا کی پذیرائی برسوں تک کی۔ پاکستان کا مصور' خطاطی اور گنبد' مینارو اور محرابوں کو اپنی کینوس پر منتقل

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرتے ہوئے فخر سے کہتا ہے کہ یہ میری تہذیب' تمدن اور ثقافت کی جھلک ہے۔ تو پھر کیا۔ ہندوستان میں بھی رادھا ناچے گی۔

لیکن —— ہندوستان کے مصوروں کی ایک کھیپ عصر حاضر کے تقاضوں سے بخوبی نمٹ رہی ہے وہ نئے رجحانات سے باخبر ہیں اور نئی تکنیکوں کو بخوبی استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً میاں بیوی کا جوڑا کنول کرشن اور دیویانی کرشن۔ گرافکس میں مہارت رکھتے ہیں۔ دیویانی نے پال کلی کی وڈوئل اصطلاحات' کو اپنایا۔ روی شنکر اور علی اکبر کا دوگانہ' دیویانی کی تصویر —— ایکشن پینٹنگ کی مثال۔ دو فنکار جب ایک جگہ' ایک ہی پیش کش میں نمودار ہوتے ہیں تو وہاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا عنصر غالب آ جاتا ہے۔ نقوش ایک دوسرے میں مدغم ہوتے۔ بھنور' لہروں کی اٹھان سرساگر کا جوش' اترا اٹھتا ہے۔ نچلے سروں کی گنجم گرتی ہے۔ دیویانی ہی کی تصویر۔ بیتھوفن اندھا ہو رہا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ کیسے ہو گیا۔ میں کیسے زندہ رہوں گا۔ میں زندہ ہوں یہ سب کچھ ناگزیر ہے۔ قدرت کا عمل ہے۔ میں بے بس نہیں ہوں۔ میں زندہ رہوں گا۔ میں اپنے موسیقار کو زندہ رکھوں گا۔ کنفیوژن۔ حادثے کا منظر۔ توڑ پھوڑ۔ پیانو بکھر گیا۔ پرزے پرزے ہو گیا۔ شناخت برقرار ہے۔ کنول کرشن نے ہمالیہ کے پہاڑوں کے درمیان گھومتے پھرتے۔ وجدان حاصل کیا۔ پہاڑ کی کوکھ کی گہرائیوں میں پنہاں رمزیت کی روشنی اور سائے کے امتزاج سے اجاگر کیا۔ ہمالیہ کے جاہ جلال سے کنول کرشن نے شکتی حاصل کی۔ اپنے اندر کی شکتی۔ اپنے فن کی شکتی۔ پرتبھا نے خود اپنی وڈوئل گرامر وضع کی۔ اس میں ابہام ہے۔ ماں' عورت کی کمزوری' محدود دنیا ماں اور بچہ۔ بچے کی پہلی سرگوشی ماں نہال ہو گئی۔ سرگوشی کے مرغولے فضا میں تحلیل ہوتے گئے۔ بچوں کے کھلونوں کی دنیا۔ جیسا گنگوی بھی۔ فیمنسٹ۔ عورت پر زیادتی سے آزردہ۔ البتہ رنجنا شپ لیال کے فن میں نئی اشکال کو دریافت کیا ہے۔ پہلے سے موجود اشکال کی شکست و ریخت کے بعد از سر نو تشکیل۔ چوں' سیپوں اور پتھروں کے امتزاج سے۔ مختلف میڈیمز کی آمیزش سے بنائے گئے سر ایک سٹلچر۔ روایت سے ہٹ کر۔ اپنے عہد کی نمائندگی۔ سائنٹیفک

حسن کاری۔ اکبر پدمسی —— ہندوستان کے عصر حاضر کے مصوروں میں ایک بڑا نام۔ ان کے ہاں فطری آزاد روی ہے۔ میڈیم بدلتے ہیں۔ موضوع تبدیل ہوتے ہیں۔ وہ انسانیت کا دکھ درد دیکھتے ہیں۔ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن لاتعلق نظر آتے ہیں۔ فرار حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں۔ حالات کی بے رحمی نے چہرے بگاڑ دیئے ہیں۔ المیہ انسان پر غالب ہے۔ اور پھر وہاں ایسی گمبھیر اداسی چھائی ہے۔ جیسے طوفان کے بعد فضا ملول اور خاموش محسوس ہوتی ہے۔

وہ ایک موچی باپ اور کسان ماں کا بیٹا تھا ہوش سنبھالا تو اخبارات اور جریدوں میں کام کرنے لگا پھر اسٹیج ڈیزائنر بن گیا۔ اس کا نام لیوپولدو فیننڈیز تھا۔ اس کی تصویر —— "عوام کا انتقام" لوگوں کی بھیڑ میں ایک پیکر ہاتھ میں کلہاڑا لئے' جوش و جذبے سے بے قابو اس کا وجود اس قدر بھاری بھرکم اور نمایاں ہے کہ سب کچھ پس منظر میں ڈوبتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

آرٹ ہیری ٹیج میں میکسکی گرافکس کی نمائشیں لگی تھی۔ میکسیکو میں سیاسی' معاشی اور سماجی انقلاب لانے میں میکسیکو ورکشاپ پاپولر گرافک آرٹ نے اہم کردار ادا کیا۔ لیوپولونیڈیز ان فن کاروں کا سرخیل تھا۔ اخبارات نے اس انقلاب میں کہاں تک ساتھ دیا۔ الفرڈوز زالیے کی تصویر۔ "رجعت پسند پریس" تیسری دنیا کا پریس۔ اقتدار کا دبدبہ۔ سچائی کے اظہار کی بے بسی۔ خوف۔ بدحالی یا پھر اسے جی۔ سٹوس کی "بے چہرہ آدمی" وہ خود کچھ نہیں ہوتے۔ ان کے چہرے مصلحتوں اور سمجھوتوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ مگر وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں وہی کچھ اٹھا کر چلتے ہیں جو انہیں تھما دیا جاتا ہے۔ چنا پرشاد اور میکسکی گرافکس کے مابین گہری مماثلت ہے۔ انسانیت اور وطن پرستی کی مماثلت۔ چنا پرشاد کے ہاں وہ بیداری ہے جس نے کلکتہ کے ادب کی آبیاری کی۔ چنا پرشاد چٹاگانگ کے ایک قریبی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ چٹاگانگ کے ایک اسکول میں تعلیم پائی اور 32 سال تک بمبئی کی مضافاتی بستی اندھیری میں رہے کلکتہ میں سن 78 میں انتقال ہوا۔ چنا سن شعور کو پہنچے تو ترقی پسند مصنفین کی تحریک زوروں پر تھی۔ چنا دائیں بازو کی سیاست میں شامل ہو گئے شاعر تھے۔ مصور تھے۔ فعال سیاسی کارکن تھے۔ "رات

allurdupdfnovels.blogspot.com

کا کیکٹس" ـــــ

یہ کالی رات گذر جائے گی۔
اس وقت تک
مجھے بہت کام کرنا ہے۔
وہ کام جسے نمٹانے' میں یہاں آیا ہوں
تاریکی کو روشنی دو
اس میں خوشبو بھر دو
میں اپنی سینکڑوں پنکھڑیاں کھولے
صبح کو سلام کرنے کا منتظر ہوں۔
ساحر نے کہا تھا
ع وہ صبح کبھی تو آئے گی۔
فیض نے کہا۔

اس دھن میں کہ ابھرے گا افق سے کوئی خورشید
بیٹھے ہیں سہارا لئے شمع سحری کا

یہ لوگ ایک ہی آئیڈیل لئے زندہ رہے اور ایک ہی طرح کے دکھ سمیٹ کر چل دیئے۔

چنا پرشاد نے حرف و نقش دونوں کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ کبھی دل کی بات اشعار میں کہہ دی۔ بنگال کے قحط' سے دگیر ہوئے تو کاغذ پر لکیریں بننے لگیں۔ بھوک سے نڈھال عورت' بچہ اور مرد۔ یا پھر روزگار' غذا' گھر اور آزادی کے طلبگار انسانوں کا احتجاج۔ چنا پرشاد منظر کشی کریں' روزمرہ زندگی کے واقعات بیان کریں ان کی تصویر میں لکیر کی توانائی اظہار کی بنیادی اساسیت ہے ان کا فن پارہ فاقہ کش کشاں میں تاثر نگاری اور تجریدیت کا خوب صورت ملاپ نظر آتا ہے۔ لائنو کٹس (Linocuts) کے میڈیم پر مضبوط گرفت سیاسی اور معاشرتی شعور' بنی نوع انسان کے دکھ درد سے نجات کی خواہش۔ چنا پرشاد نے بنگال مکتب مصوری کی روایت کو برقرار رکھا اور مغرب سے آنے والی جدتوں سے لاتعلق

رہے۔

آرٹ ہیری ٹیج کی نگران خاتون۔ تراشے ہوئے بال ساڑھی پہنے' محنت میں دل لگانے والی' پڑھی لکھی' میں نے اپنا تعارف کروایا تو بڑے پیار سے ملی اور جھٹ سے اپنے ادارے کی نئی پبلی کیشن پیش کر دی۔ جی راضی ہوا۔ اب تک جو بھی ملا۔ کچھ اسی انداز سے ملا۔

وہ بی بی' جو قرول باغ میں ایک کافی شاپ چلاتی ہے۔ وہ بھی ہمارے آرڈر پر کافی بنا کر لائی تو پاس آ بیٹھی تھی۔ ایم اے تک پڑھی ہوئی ایک شرابی شوہر کی بیوی۔ ماں باپ کو اپنا حال نہیں بتاتی کہ دکھی ہوں گے۔ کہ ان کی اکلوتی اولاد کن مصائب میں گھری ہے۔ بچوں کا خیال آتا ہے۔ انہیں لے کر کہاں جائے گی۔

اس روز شام ڈھلے اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہی تھی۔ میرے قریب ایک شخص اونگھ رہا تھا۔ سوچا۔ دن بھر کے کام سے تھک گیا ہے۔ بس رکی۔ کنڈکٹر نے آواز لگائی "یوسف سرائے" میں اتر گئی۔ چند اور سواریوں کے ساتھ وہ بھی اتر گیا۔ سڑک پر پاؤں رکھے تو خیال آیا کہ اوہو۔ اس کا بس اسٹاپ تو پیچھے رہ گیا۔ بوکھلایا کھڑا تھا۔ کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ جیسے وہ اس قسم کے واقعات کے عادی ہوں۔ وہ ضرور کسی سستے سے شراب خانے میں شام گذار کر آیا تھا اس کا دکھ کیسا تھا۔ اسے یہ لت کیوں پڑی۔

کافی شاپ کی مالکن کا شرابی شوہر۔

یہ لوگ جنہیں محض دھتکار دیا جاتا ہے۔ انہیں بھی کسی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب ان کا مرض زیادہ بڑھ جاتا ہے تو پھر وہ ہر رعایت' ہر توجہ کا استحصال کرتے ہیں۔ میرے ہم سفر نے اب اس طرف چلنا شروع کر دیا تھا جدھر سے بس آئی تھی۔ پتہ نہیں وہ رات کو اپنے گھر پہنچا یا نہیں۔ اس کا کوئی گھر تھا بھی کہ نہیں۔

بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ یہی 70ء کے عشرے کے اوائل کا کراچی کے سوویت فرینڈ شپ ہاؤس میں کوئی تقریب تھی۔ غالباً روسی خواتین کا دن تھا۔ پہنچ گئے وہاں۔ فرینڈ شپ ہاؤس کے لان میں بیٹھ کر گپ شپ کی۔ روسی خواتین کی

allurdupdfnovels.blogspot.com

تقریریں سنیں۔ رپورٹ بنائی اور لوٹ آئے اگلے روز ادارے کے ایک "پھنے خان" کا فون آیا۔

"کل آپ فرینڈ شپ ہاؤس گئی تھیں"

"جی۔ اسا ئنمنٹ تھی۔ تو کیا؟"

اس وقت ان کے پاس انٹیلی جینس کا ایک افسر بیٹھا تھا۔ دونوں کو فکر ہو رہی تھی کہ ہماری کل کی شام کے بعد ایک نظریاتی مملکت کو جو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اسے ٹالنے کے لئے کون سے اقدامات کئے جائیں۔

دہلی اور ماسکو والے برسوں سے ایک دوسرے کی فرینڈ شپ کے حامی رہے۔ ماسکو یونیورسٹی میں سنسکرت پڑھائی جاتی ہے۔ وہاں انڈولوجی کے نام سے قدیم و جدید ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر تحقیق کی جاتی ہے اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ اس طرح دونوں ملکوں کے مابین افہام و تفہیم کے وسیلے بنے۔

ان دنوں جے پور ہاؤس میں جو ماڈرن آرٹ کا میوزیم ہے۔ روسی تصاویر کی نمائش لگی تھی انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کے وسطی عشروں کے دوران بنائی گئی تصاویر

ایک بار میں نے سلے بھائی سے پوچھا کہ آپ نے عمر بھر روسی سوشلسٹ نظام کے گن گائے ہیں۔ وہاں کی شخصی آزادی، مزدور اور کسان کی معیشتی برتری اپنی جگہ۔ لیکن وہاں آزادی اظہار نہیں ہے وہاں کا میڈیا آزاد نہیں۔ سلے بھائی میرے اس سوال کا کھل کر جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔ کچھ مصلحتیں آڑے آئیں تھیں۔ بہر حال کہنے لگے کہ اس سسٹم میں کوئی خرابی نہ تھی۔ ایک عام انسان کے لئے وہ ایک بہترین نظام تھا۔ مگر اس کے نفاذ میں کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ اس سے خرابی پیدا ہوئی۔ برسوں پہلے آئن ریڈ نے وی وی لینگ، لکھتے وقت بیسویں صدی کے آواخر میں پانی سر سے اوپر گزر جانے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ایک ایسا نظام کہ کوئی بھی شخص کسی کے گھر پر دستک دے کر وہاں براجمان ہو سکتا تھا۔ جہاں راشن کی تقسیم میں جانبداری ہونے لگی ہو۔ ملازمتوں میں کرپشن نے جگہ بنالی ہو۔

بہر حال اس نظام کا آغاز ایک خوبصورت مستقبل کو سامنے رکھ کر ہوا جہاں کسان۔

جے پور ہاؤس میں منعقد ہونے والی تصویر نمائش میں مکافیلی والا میری "کسان عورت اپنے کھیت میں" عورت کے چہرے پر بشاشت ہے۔ وہ پر اعتماد نظر آتی ہے اس کے چہرے پر جاگیردار کا خوف نہیں ہے۔ واندروز کی پورٹریٹس، عام زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ۔ ہم اور آپ جیسے ٹالسٹائی اور دوستو فیسکی کے کردار۔ 1917 کے اکتوبر انقلاب کے بعد سوویت مصوروں نے شعوری طور پر اپنی تصویروں کو سہل بنا دیا تھا کہ وہ عام شخص کی سمجھ میں آسکیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ السٹریٹو تھیں۔ پلاٹ کی پابند تھیں۔ وہ لینڈ اسکیپ ہو۔ کوئی تاریخی واقعہ ہو۔ فن کار رنگ و نقش کے ذریعے عام لوگوں سے مخاطب ہوتا تھا۔ وہ فیکٹری کے مزدوروں اور کسانوں تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتا تھا۔ باہر کی دنیا کی طرف کھلنے والے کواڑ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ آیازو فسکی کی تصویر "طوفانی سمندر" اگر برطانوی مصور ٹرنر کے فن سے مشابہت رکھتی ہے تو یہ محض اتفاق ہے۔ سوویت مصور کا سب کچھ، وہ جو کچھ بھی تھا اس کا اپنا تھا۔ وہ محض وطن پرستی تھی۔ چیتانوف کولس نے موسم سرما، میں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں میں سیاہ اور سفید رنگوں کے امتزاج سے وڈوئل غزل کہہ دی تھی۔

جے پور ہاؤس کے ہال میں کچھ دیر پہلے میرے علاوہ کوئی اور نہ تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سے سکوت ٹوٹا۔ قریب سے کچھ مانوس سی مہک آئی۔ ارے تم لوگ۔ یہاں کیسے۔ کب آئے۔ اور تم۔ مجھے چند روز ہوئے ہیں۔ میں بمبئی میں رکی تھی۔ اب لمبا پروگرام ہے۔ اچھا۔ یہاں دہلی میں دیری گڈ۔ ہال میں یہ حیرت بھرے خوشی بھرے جملے اڑتے نظر آتے۔ یہ شیما اور خالد تھے۔ پھر ہم تینوں کچھ دیر بعد جے پور ہاؤس کے کینٹیریا میں چائے پیتے ہوئے اپنے اپنے پروگرام بنا رہے تھے۔ ان دونوں شیما کرمانی کلاسیکی رقص کا کورس کر رہی تھی۔ شیما نے اپنے فن کا آغاز مصوری سے کیا۔ لندن اور پیرس تک گئیں۔ کلاسیکی رقص تک پہنچ گئیں۔ خالد انجینئر بنے۔ بیرون ملک سے ڈگریاں لائے۔ لیکن ڈرامہ کرنے لگے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اسی فن کا فروغ ان کا مقصد زندگی بن گیا طے پایا کہ شیما رقص کی کلاس لینے چلی جائیں جبکہ میں اور خالد پراگتی میدان جا کر ہندوستان کی ریاستوں اور صوبوں کے ماڈلوں سے گھری اس تفریح گاہ کی سیر کریں۔ میں اور خالد۔ کراچی سیاست۔ دہلی۔ نہ جانے کیا کچھ باتیں کرتے گھومتے پھرتے آخر کو پراگتی میدان کے سامنے پان والے کے پاس آ کر رک گئے۔ ہندوستان میں بھی لوگ پان کھاتے ہیں۔ لیکن اس ذوق و شوق سے نہیں کہ کھاتے کھاتے ایک دم در و دیوار پر برسنے لگیں۔ دھت۔ تم پان نہیں کھاتیں تو لو۔ یہ لو۔ پچک' پچک۔

بہت دن سے بڑی محفوظ سیاحت ہو رہی تھی۔ گویا سرکاری محض دہلی کی گلیوں میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ دن بھر کے بعد گھر لوٹتی تو انوپا اور سوہنو میری خاطر مدارت کرنے کو کوئی نئی آرٹ مووی لے آتے۔ لحاف میں گھس کر فلم دیکھتے اور مونگ پھلی چلغوزے کھاتے۔ ایسے ہی جیسے سردیوں کی چھٹیوں میں اپنے آبائی قصبے حویلی چلے جائیں۔ نہیں جی۔ اب یہاں سے نکلنا چاہئے۔ انوپا نے حسب عادت اخبار دیکھتے ہوئے بتایا کہ آج فلاں فلاں گیلری میں فلاں آڈیٹوریم میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا دیکھو آج مجھے جواہر لال یونیورسٹی جانا ہے۔ مجھے سبطے بھائی کا ایک خط پروفیسر محمد حسن کو پہنچانا تھا۔ انوپا میرا پروگرام سنتے ہی بسوں کے نمبر سمجھا دیتی تھی۔ اور میں بیگ کندھے پر ڈال کر یوسف سرائے کے بس اسٹاپ کی طرف چل دیتی۔ گل موہر ایکسٹینشن کے گیٹ کے سامنے ایک موچی بیٹھا رہتا۔ اس سے ایک روز میں نے اپنا ادھڑا ہوا سوٹ کیس بھی سلوایا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی سبزی منڈی پڑتی تھی۔ شلجموں' گاجروں کے ڈھیر۔ پالک کی ہریالی۔ دہلی ویسے بھی لاہور سے جغرافیائی طور پر زیادہ دور نہیں۔ ان لوگوں کے چہروں کی رنگتیں بھی ہم جیسی ہیں۔ پھل اور سبزیاں بھی۔ موسم بھی۔

جواہر لال یونیورسٹی میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر پروفیسر محمد حسن کو جا پایا۔ ایک مرنجان مرنج قسم کے شخص۔ انہیں مجھ سے مل کر بالکل کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ پروفیسر محمد حسن اکثر پاکستان آتے رہتے تھے۔ ادبی مذاکروں میں۔ وہ یہ تو

جانتے ہوں گے کہ ہندوستان سے کوئی بھی آ جائے ہم دل و جان قربان کرنے کی ثانی ضرور جیتتے ہیں۔ میں ان کے پاس بیٹھی ہندوستان کے بارے میں اپنے تجسس کا ذکر کرتی رہی۔ انہوں نے ازراہ کرم کچھ کتابوں کے نام بتائے۔ یہ رہنمائی بھی کی کہ یہ کتابیں کناٹ پلیس سے مل جائیں گی۔ "ہاں اگر سبط حسن کے مطلوبہ مضامین دستیاب ہو گئے تو وہ میں کسی کے ہاتھ آپ کو بھجوا دوں گا۔" مگر انہوں نے ایسا کرنے کی زحمت نہ کی۔

جواہر لال یونیورسٹی میں دسمبر کی چھٹیاں تھیں۔ پھر بھی کچھ اسٹوڈنٹس' لڑکے اور لڑکیاں ادھر ادھر بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔ دائیں بازو کی کسی تنظیم کا ایک رکن مارکس پر پمفلٹ اور کتابیں فروخت کر رہا تھا۔ ہندوستان سے مذہبی منافرت کی خبریں اکثر آتی رہتی ہیں۔ لیکن سیکولرازم بھی یہیں ہے۔ جسے ہم مذہبی عصبیت میں بے دینی کہتے ہیں اور ان معانی سے گریز کرتے ہیں کہ سیکولرازم دراصل اپنے اپنے عقیدے اور مذہب پر قائم رہتے ہوئے' دوسرے کے عقیدے کے لئے برداشت پیدا کرنے کا نام ہے۔ ذہنی آزادی کا نام ہے۔ قلبی وسعت کا نام ہے۔ جواہر لال یونیورسٹی میں ایک مسلمان پروفیسر اپنے شعبے کا سربراہ ہے۔ وہاں مارکس ازم کے بارے میں لٹریچر فروخت کرنا جرم نہیں۔ مارکس پر مضمون شائع کرنے پر کسی جریدے پر پابندی نہیں لگائی جاتی وہاں مزدوروں کی بیداری کے لئے اسٹریٹ پلیز ہوتے ہیں۔ ان موضوعات پر فلمیں بنتی ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

گوالن سمجھ رہی تھی کہ اس کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اس نے اپنے گاؤں گوکل والوں کو بتا دیا کہ دیکھو یہ بچہ!! یہ میرا بیٹا ہے۔ مگر وہ نہ رویا تھا۔ نہ اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ جب تک کہ گوالن نندا کی بہن رادھا نہ آ گئی اور جب اس نے پکارا تو بچے نے فوراً اپنی آنکھیں کھولیں اور زور زور سے رونے لگا۔ ہندو مائی تھولوجی کی ایک مشہور کہانی۔

بس متھرا کے اڈے پر کھڑی تھی۔ میں آج سویرے 9-10 بجے اپنی پیاری دوست اور اس کے بچوں کی محبت سے آزاد ہو کر ایک طویل سفر کے لئے چل نکلی تھی۔ بہت جی چاہ رہا تھا کہ عوامی بسوں کے جھٹکے کھائے جائیں۔ ان جانے مقامات پر ٹھکانہ تلاش کرنے کی تگ و دو کی جائے کچھ سفر کے خدشات مول لئے جائیں۔ جہاں رات پڑ گئی رک جائیں گے۔ جی چاہا تو اگلی راہ دیکھیں گے۔ بڑا مزہ ہے اس کام میں۔ سفر میں۔ کوئی چیز دہرائی نہیں جاتی۔ ہر روز ایک نیا باب کھلتا ہے۔ اگلے روز پھر نیا باب' نئی جگہ منظر کا نیا وار' نئی جستجو۔ بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ گٹھڑیاں' منڈوقے' پاکپتن' اوکاڑہ' بہاولنگر جانے والی بسوں کی طرح کے لوگ۔ میرے ساتھ ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ بس عمر اتنی ہو گی کہ تعلیم ختم کر کے چار پانچ سال سے ملازم ہو گیا ہو۔ شاید ماں نے شادی کر دی ہو ایک دو بچے بھی ہوں۔ دہلی کا ایک اخبار پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے وہ مجھے تھما دیا متھرا پر اترنے لگا تو کہا آپ یہ اخبار رکھ لیں آپ کو ابھی آگے تک جانا ہے' اس کی یہ بات بھلی لگی۔ متھرا کے بازار میں بڑا رش تھا۔ ہندوؤں کے دیوتا شری کرشن کی جنم بھومی۔ متھرا کے پیڑے بڑے مشہور ہیں۔ اب ہزاروں برس گذر جانے کے باوجود دہلی کی کناٹ پلیس کے انپوریم میں ایک جگہ لسی کی چاٹی اور مدھانی رکھی

تھی جس کا ڈھکنا سرکا کر ایک بچہ اس میں ہاتھ ڈالے تھا۔ یہ بھی کرشن تھے۔ کرشن گوپال کو گوپی لڑکیاں ہی نہیں مکھن بھی بہت مرغوب تھا۔ پندھرویں صدی کی مغربی ہندوستان کے لوک مصور کی بنائی ہوئی تصویر۔ کرشن کی دودھ پلائی ماں یسودا نے اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر اسے ایک بڑے ستون سے باندھ دیا تھا۔ کرشن بھگوان میں اتنی شکتی تھی کہ اس نے دو درختوں کے درمیان بنے ستون کو اتنے زور سے کھینچا کہ اس کے ساتھ درخت بھی جڑ سے اکھڑ گئے۔

کرشن بھگوان کا متھرا۔ آگرہ جانے کا مضبوط ارادہ کمزور پڑ رہا تھا۔ جی چاہا کہ بس سے اتر جاؤں آگرہ اگلے روز چلی جاؤں گی۔ بھاڑ میں جائے آگرہ کا ٹکٹ مگر ڈرائیور کو میرے تذبذب کی خبر نہ ہوئی اور اس نے بس چلا دی۔

متھرا کے بازار میں نوعمر لڑکیاں سائیکلوں پر سکول سے لوٹ رہی تھیں۔ بھیڑ میں بڑے اعتماد سے آراستہ بناتی ہوئی۔ دوکاندار' خریداروں کے ساتھ مصروف تھے۔ وہاں میرے علاوہ ایک چھوٹے سے قصبے میں سائیکل چلاتی لڑکیوں پر کوئی نہیں چونکا تھا۔ بیگ میں سے سینڈوچ نکالے اور لنچ کر لیا۔ سردیوں کے چھوٹے دن۔ شام 4 بجے بس آگرہ پہنچی تو سورج کی روشنی پھیکی پڑنے لگی تھی۔ اجنبی شہر بس نے نہ جانے کہاں اتار دیا تھا جو لوگ دہلی اور متھرا سے اس بس میں سوار تھے ان میں کوئی بھی میرے جیسا بے ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ کسی کام سے آئے تھے یا کوئی کام بھگتا کر لوٹے تھے۔ پل بھر میں اپنے جانے پہچانے راستوں پر چلتے ہوئے غائب ہو گئے جبکہ مجھے ٹورسٹ آفس کی تلاش تھی۔ جس کے ذریعے کسی معقول ہوٹل کا پتہ معلوم کیا جا سکے۔ معقول سے میری مراد یہ کہ وہ محفوظ بھی ہو اور سستا بھی۔ ہوٹل کی بکنگ میں دیر نہ لگی۔ باہر ایک سائیکل رکشا کھڑا تھا۔ اس میں اپنا بیگ وغیرہ رکھا اور وہ رواں ہو گیا ہوٹل زیادہ دور نہ تھا۔ کئی ایکڑ زمین پر کھلا کھلا۔ برآمدے' بڑے بڑے کمرے جیسے ماڈل ٹاؤن لاہور میں آ گئے ہوں انگریز کے زمانے کی پلاننگ ہوٹل کے مالک کو دیکھا تو لگا کہ یہ ابھی کہے گا کہ میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا کنبہ تقسیم کے بعد یہاں آ بسا تھا۔ اس نے پنجابی میں ملازم کو بلایا کہ مجھے کمرے تک پہنچا دے۔ سامنے سے ایک دبلی پتلی سبک سی دیوی جی

allurdupdfnovels.blogspot.com

ساڑھی پھڑکاتی دکھائی دیں۔ انہوں نے نوکروں کو آواز دی۔ "ارے رامو' جلدی کرو دیکھتے نہیں پسنجر آ رہے ہیں۔"

لق و دق ہوٹل خالی خالی تھا۔ ہر سو بے توجہی بکھری ہوئی۔ برآمدے کے سامنے رکھے گملوں کی بے چارگی۔ لان کی سوکھی ہوئی گھاس۔ جیسے وہ ہوٹل یا تو آؤٹ ڈیٹڈ ہو گیا تھا۔ یا پھر کسی خاندانی جھگڑے کا شکار۔ جیسے وہاں باپ کے مرنے کا انتظار ہو رہا ہو۔ خدا جانے اس کا وارث کون ہو یہ کس کے حصے میں آئے۔ وہی کنجے کا ٹھکانہ اور وہی کمائی کا وسیلہ۔ بیمار صنعت' جیسا —— کئی کمروں پر تالے پڑے تھے۔ ایک کمرے کے سامنے بید کی آرام کرسی پر تولیہ پڑا سوکھ رہا تھا اور کمرے کے اندر سے لتا کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ ٹورسٹ نہیں ہو سکتا تھا کیا ٹورسٹ کو تولیہ سوکھنے کے انتظار میں گانے سننے کی فرصت نہیں ہوتی۔ اس کمرے کا مکین کسی دفتری کام سے آیا لگتا تھا۔ رات بھر کو ٹھہرا تھا۔ چلو خیر —— لیکن --- سردی بہت تھی۔ اونچی چھت والا کمرہ جنوری کی آخری تاریخوں میں یخ ہو رہا تھا۔ آگرہ مجھے دہلی سے اتنا ہی زیادہ ٹھنڈا لگا جیسے لندن سے برمنگھم۔ ریسپشن پر فون کر کے ہیٹر منگوایا تو کچھ جان میں جان آئی۔ مگر باتھ روم اس زمانے کا بنا ہوا تھا جب واٹر مکسر ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ ایک نل ٹھنڈے پانی کا' دوسرا گرم کا۔ انہیں خود ہی مکس کرو۔ کبھی ہاتھ ٹھنڈا کرو۔ کبھی اسے گرماؤ۔ بس اس طرح کام چلانا پڑے گا۔ چائے منگوائی۔ کچھ دیر کو بستر میں گھسی ٹورسٹ دفتر کا عطا کردہ آگرہ کے بارے میں پمفلٹ پڑھنے لگی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ پتہ چلا کہ ٹورسٹ بس ہر ایک گھنٹے بعد مل جاتی ہے دن بھر میں فتح پور سیکری اور تاج محل کا ٹوور مکمل ہو گا۔

ہوٹل میں کھانے کا انتظام نہ تھا۔ اس لئے کھانے کی تلاش مجبوری تھی۔ کوٹ سویٹر چڑھا کر باہر کا رخ کیا تو گیٹ کے قریب وہی شام والا شخص اپنے سائیکل رکشا کو میری طرف لاتا نظر آیا۔

"جی میم صاحب' نمشار' میں آپ کو لے چلتا ہوں"

"مگر یہاں قریب میں کوئی ریسٹوران نہیں کیا"

"رات ہو رہی ہے جی' آپ اکیلی نہ جائیں"

میں نے اس کی بات مان لی مگر ٹہلنے کا پروگرام منسوخ ہونے پر خوش نہ تھی۔ اس نے مجھے کچھ ہی فاصلے پر ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں آگرہ کی دودھیا روشنی میں رات گذارنے والے سیاحوں کی خوب چہل پہل دکھائی دی۔ ریسٹوران اجلا اجلا۔ بڑی بڑی ایرونگ تصویریں۔ اچھا —— !! میں نے حیرت سے ان تصویروں کو دیکھا۔ ایک چھوٹا سا شہر۔ مگر ایسی بے باکی جسے کوئی روک ٹوک نہیں۔ سیاحوں کے لئے بہلاوے لیکن —— کچھ بد ذوقی بھی تھی وہاں۔ نیوڈ تصاویر کی نمائش کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اتنی کھلی کھلی اور تیز روشنیاں جیسے کسی عورت کو سربازار برہنہ کر دیا ہو۔ سور ٹیلسٹک' تصاویر بنانے والا تو ویسے بھی عمل پسند ہوتا ہے۔ حقیقت نگار مصور کے برعکس وہ تصویر میں رنگ بھرتے وقت جذباتی نہیں ہوتا۔ حقیقت نگاری میں حقیقت اور خوابناکی دونوں کبھی ہم آہنگ ہوتی ہیں تو کبھی متصادم۔ وہ کبھی فطرت کے پھیکے رنگ میں شوخی بھر دیتا ہے تو کبھی سینوں اور کولہوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے انہیں سلانے لگتا ہے۔ سور ٹیلزم نے حقیقت اور خواب کو الگ الگ کیا۔ جیسے حق گوئی۔ سچی بات' وہ جتنی شیریں ہو یا تلخ اس کا جوں کا توں اظہار اس میں کوئی حاشیہ آرائی نہیں۔ ٹھوس حقیقت نفسیاتی خود کاری —— جہاں خیال پر کسی جمالیاتی رکھ رکھاؤ یا اخلاقیات کا لحاظ نہیں ہوتا۔ کھری حقیقت —— ریسٹوران کی تصویر میں نسائی پیکر کے خطوط بھی یہی کچھ تھے۔ قریبی میز پر دو جاپانی لڑکیاں کھانا کھا رہی تھیں۔ تاج محل' شاہجہاں کی محبت کی انتہا۔ دنیا بھر کے سیاحوں کو اس طرح کھینچ رہا ہے۔ برسوں سے۔ صدیوں سے یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔

دیوان نے بادشاہ سے کہا۔ "حضور اب کے بارشیں دیر سے ہوئی ہیں۔ کسانوں کی فصلیں برباد ہو گئی ہیں۔ ان کی مالی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ میں ان کے ٹیکس میں کچھ کمی کر دوں۔ خزانے کی کثیر رقم عفت مآب ممتاز محل کے مقبرے کی تعمیر پر صرف ہو رہی ہے۔ بتائیں کیا کرنا چاہئے۔ بادشاہ سلامت۔!!

allurdupdfnovels.blogspot.com

بادشاہ نے جو تاج محل کے ماڈل کو دیکھنے میں غرق تھا —— جواب دیا۔ "بعد میں، بعد میں"

آگرہ کے ریلوے اسٹیشن کے باہر ٹورسٹ بسیں کھڑی تھیں۔ دہلی سے آگرہ ایکسپریس کا انتظار تھا۔ کچھ دیر میں مسافروں کا ایک ریلا آیا۔ اور سب لوگ کچھ امریکی، جاپانی زیادہ تر ہندوستانی۔ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے بس میں آکر جم گئے۔ وہ جوڑا امریکہ سے آیا تھا۔ اپنے عزیزوں سے ملنے کی خاطر۔ ہندوستان میں رہنے والے ہندو نے ماتھے پر سیندور کا تلک لگایا ہوا تھا۔ امریکہ والا اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ارے بابا پوجا کر کے آیا ہوں۔"

"کیا پیٹ پوجا کر کے آیا ہے۔" دونوں ہنسنے لگے۔

کسی نے کہا ڈاکٹر ژواگو، فلم دیکھی۔ نہیں پھر عرصے بعد —— "ڈاکٹر ژواگو" پڑھی۔ نہیں، اوفو! تو پھر کچھ نہیں دیکھا اور نہ پڑھا۔ کسی نے کہا مغل اعظم کیا زبردست فلم ہے۔ نہیں۔ اس وقت تک نہیں دیکھی جب تک ویڈیو ایجاد نہ ہوا۔ تاج محل دیکھا۔ نہیں۔ میرے سامنے کوئی کسی چیز کی بہت تعریف کرے تو اس سے چڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ بھلا اسے کیا دیکھنا جسے دنیا بھر نے دیکھ لیا ہو۔ لیکن کچھ تخلیقات۔ نہ جانے کیسے۔ اتفاق سے شاید۔ یا پھر اس کی تعمیر و تخلیق میں کوئی بڑی قوت، کوئی بہت ہی شدید جذبہ شامل ہو جاتا ہے پاگل پن۔ جنون۔ پھر وہ تخلیق کے رگ و ریشے میں یوں سرایت کر جاتا ہے کہ اس کی مقناطیسیت کا تخلیق کار سے ناطہ تک مختل ہونا جنگی بن جاتا ہے چھوت کی طرح۔ مجبوری کی مانند۔

ڈاکٹر ژواگو، مغل اعظم یہ دونوں فلمیں اور تاج محل۔ ان سب نے مجھ پر ایک ہی انداز میں وار کیا تھا۔ جبکہ میں ان سے مایوس ہونے کے لئے بھی ذہنی طور پر تیار تھی۔ کہ مجھے زیادہ افسوس نہ ہو۔

اس روز آسمان بالکل صاف تھا۔ چند روز قبل جب بمبئی میں آرکیٹکٹ یحییٰ مرچنٹ سے ملاقات ہوئی تو وہ میرا پروگرام سن کر بتانے لگے کہ میں جب کام کاج سے تھک جاتا ہوں تو آگرہ چلا جاتا ہوں اور گھنٹوں تاج محل کے سامنے بیٹھا رہتا

ہوں۔ اس طرح مجھے بہت سکون ملتا ہے۔ بقول آرکیٹکٹ مرچنٹ کے موسولیم یا مقبرہ کسی شخصیت کی تجریدی شکل ہوتی ہے۔

ممتاز محل کا گنبد ----!!

شاہجہان نے ترک آرکیٹکٹ کو بلایا۔ کہا کہ تاج محل کا گنبد ایسا ہو جیسا آج تک کسی نے نہ بنایا ہو۔ جیسے غبارہ!! نہیں جیسے بھرے بھرے سینے کی اٹھان۔

آرکیٹکٹ یحییٰ مرچنٹ کہہ رہے تھے۔ ملکہ ممتاز محل بڑی عورت تھی۔ بہت خوبصورت تھی۔ تاج محل کا مرکزی گنبد ملکہ ہے۔ چار مینار۔ اس کی خادمائیں ہیں اور چھوٹے گنبد۔ وہ کنیزیں، جو اپنی ملکہ کی پیڈی کیور تک کر رہی ہیں۔

جمنا کے اس پار۔ بہت دور آسمان کی نیلاہٹوں کے جلو میں۔ اس قدر قریب کہ وہ واضح نظر آئے۔ پیڑوں کی آڑ سے۔ آنچل کی اوٹ سے —— جھانکتا ہوا جیسے کوئی پری چہرہ۔ آگرہ کے لال قلعے کی بالکونی سے تاج محل کی پہلی جھلک —— مبہوت کر دینے والا نظارہ اس منظر میں گرد و پیش اور فطری ماحول کے علاوہ لال قلعے کا دخل بھی ہے۔

لال قلعہ، تاج محل کو بڑے سلیقے سے پیش کرتا ہے۔ ساحر لدھیانوی کو شاہجہان پر بہت غصہ تھا۔ شاعر کو بادشاہ کی دولت اور شاہ خرچی کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن کوئی اس کی بے بسی بھی تو دیکھے ایک بالکونی میں بیٹھے بیٹھے 8 سال گذار دیئے اس حسرت کے ساتھ کہ براق تاج محل کے قریب سیاہ پتھر سے بنا اس کا اپنا مقبرہ ہو گا —— اور دونوں مقبروں کو سونے کا ایک پل ملائے گا۔

یہ زندگی سے بڑی خواہش تھی۔ جسے پورا نہیں ہونا تھا۔

لال قلعے سے نکلنے کے بعد تاج محل کو قریب سے دیکھنے کا امکان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس تک رسائی میں فن تعمیر کی ذہانت شامل ہے۔ ایک مغل ملکہ —— بھلا کس طرح یکدم سامنے آجائے۔ تاج محل کے داخلی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے تاج کا نصف گنبد اور نچلا محراب دکھائی دیا۔ تاج کے دربار میں بچے، عورتیں، مرد سبھی حاضر تھے ہر طرح کی عورتیں اور مرد۔ ساڑھی، شلوار قمیض پر

allurdupdfnovels.blogspot.com

شالیں اوڑھے ہندوستانی عورتیں' چلون قمیض' جینز اور اسکرٹ پہنے غیر ملکی سیاح عورتیں۔ کچھ ساتھی مردوں کے ساتھ اور کچھ وہ سہیلیاں جو مل کر سیاحت کے لئے نکلی تھیں۔ ایک نوجوان نے بڑی محبت سے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھا جیسے کہ اس تاریخی رومان کی قسم کھا رہا ہو۔ کچھ قدم اور آگے بڑھے تو لگا کہ جیسے تاج داخلی دروازے کی محراب کے فریم میں جڑ دیا گیا ہو۔ ہلکے نیلے آسمان کے پیش منظر میں چمکتا ہوا براق تاج محل جیسے جادوگری کا وہ پر تو تیرتا ہوا پربت کی نیلاہٹوں میں کھو جائے گا۔ اسراریت سے بھرپور حسن۔ ادھ کھلا شرماتا ہوا۔ مگر سامنے آنے پر آمادہ —— اپنے دیدار پر مائل۔ مگر وہ تاج جو سامنے کے چبوترے پہ بیٹھ کر نظر آتا ہے۔ پورے کا پورا سرتاپا بت پر شکوہ ہے۔ کبھی پانیوں میں سے جھانکتا ہوا۔ مرتعش ہوتا ہوا۔ جیسے کوئی حسینہ دلنوازی سے مسکرا دے۔ شرما شرما جائے۔ نظر اٹھا کر دیکھیں تو یوں جیسے نیلے آسمان کے مدمقابل آگیا ہو۔ زمانے کے مدمقابل ایک مضبوط ارادے کی طرح اپنی حیثیت منوانے کے دعوے کی طرح۔

مورتی' ٹی این مراری کا کردار' جو تاج محل کی جالیاں تراشنے پر متعین کیا گیا تھا۔ مورتی بہت بڑا کاریگر تھا۔ اس کی شہرت ہی اسے بادشاہ کے دربار تک لے آئی تھی۔ وہ راضی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے مندر کے لئے درگا ماتا کی مورتی تراشنا تھی۔ یہی اس کا کسب تھا' اس کا دھرم تھا۔ اس کا کرم تھا۔ لیکن وہ بہتر روزگار کی خاطر اپنی حاملہ بیوی کو چھوڑ کر آگرہ چلا آیا تھا۔

ہندوستان کی عظیم الشان عمارت فن تعمیر کے دو مختلف مکاتب کا امتزاج ہیں۔ مقامی ہندو فن تعمیر' اور ترک و افغان اسلامی فن تعمیر۔ ترک افغان اپنے ساتھ ایسا خیال لے کر آئے تھے جو انہوں نے کہیں اور سے اپنایا تھا۔ مگر ایک خواہش اور خیال کو حقیقت کے قالب میں ڈھالنے کے لئے ہندو ماہرین تعمیرات پر انحصار ناگزیر تھا۔

مورتی نے پتھر کی سلیب پر ہاتھ پھیرا اسے انگلیوں سے تھپتھپایا۔ وہ گھنٹوں پتھر کے اس ٹکڑے کے سامنے بیٹھا کچھ سوچتا رہتا تھا وہ اس کی گہرائیوں تک رسائی پانا چاہتا تھا۔ اس نے وہ ڈرائنگ نکالی جس کے مطابق اسے جالی کو تراشنا تھا۔ وہ

دیئے گئے ڈیزائین کو دیکھ کر پریشان سا ہو جاتا تھا۔ سیدھی عمودی خطوط پر مبنی وہ اقلیدسی ڈیزائین ہندو کاریگر کو ہر طرح کے تخیل سے خالی معلوم ہوتا تھا۔ اسے اپنے اس کام میں کامیابی موہوم نظر آئی اسے پتھر کی جالی کے ڈیزائین میں کوئی جاذبیت کوئی حسن نظر نہ آتا تھا کہ اس کے ہاتھ تو اشکال کی پیچیدگیوں کے عادی تھے۔ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے' ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے خمیدہ خطوط' انسانی جسم کے خدوخال کا زیروبم

جیسے اپسرائیں رقص کناں ہوں۔

تاج محل کے داخلی دروازے سے اندر آکر چبوترے پر بیٹھ کر تاج محل کا نظارہ' گنبد مینار' محرابیں' —— ترک افغان شہنشاہ کی محبت میں ڈوبی خواہش کی تکمیل مقامی ہندو ماہرین تعمیرات کی مرہون منت۔

کھردرے مزاج والے ہندوستان کے فاتح مسلمان اپنے پیچھے سوکھے' پتھریلے' بے آب و گیاہ پہاڑ چھوڑ کر آئے تھے' انہیں منطقہ حارہ کے مرطوب جنگلات زیادہ پسند نہ تھے۔ وہ جنگجو اور بت شکن ٹھہرے۔ ہندوستان کا اپنا فن تعمیر دیوتاؤں اور دیویوں کے مجسموں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ اپنے فاتحین کے حکم کی تعمیل میں جب انہوں نے عمارتوں کی دیواروں کو انسانی اشکال کے بجائے گل بوٹوں اور بیلوں سے سجایا تو وہاں بے ساختگی کا عنصر ختم ہو گیا۔ خط کی بلورین نزاکت کے بجائے وہاں وقت طلب نقوش ابھرے۔ بہت محنت سے کی گئی فرض کی ادائیگی۔

مقامی کاریگر نے اپنے خواب کی تعبیر کی خواہش ترک کر کے اپنے نئے آقاؤں کے لئے امری یادگار بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

دو مختلف مکاتب فکر' دو متضاد فنون تعمیر ایک دوسرے میں تحلیل ہوئے تو نتائج مایوس کن نہ تھے بلکہ وہ اپنی متانت' ملال اور رومانوی انداز میں پراثر معلوم ہوئے۔

جمنا کی دھند سے ابھرنے والا تاج محل کا لولوی پرتو اس کی خوبصورت مثال ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

تاج محل کا بیرونی منظر وسیع اور کشادہ ہے۔ مگر اس کا داخلی منظر اس خوبی کی نفی کرتا ہے۔ وہاں غار کی سی تنگی اور نیم تاریکی ہے۔ جیسے پتھر کی گلکاریاں بار بار کاٹتی ہیں۔

تاج ایک اکائی ہے تو فتح پور سیکری بہت سی چھوٹی بڑی اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ تاج میں جذباتی دھارا ایک ہی رخ میں بہتا ہے۔ مصلحتوں کی زیریں لہروں سے بے نیاز۔ ایسی دھن جس میں کوئی سمجھوتہ خلل نہ ڈال سکا حالات و واقعات رکاوٹ نہ بن سکے۔ عشق و محبت کی فسوں انگیزی' ایسا فن جو عشق نے تخلیق کیا تھا۔

اکبر عمل پسند تھا۔ وہ ایک کامیاب سیاستدان تھا۔ بہترین پبلک ریلیشنز افسر۔ فتح پور سیکری کا پنج محل۔ پانچ منزلہ بدھ مندر کے نقشے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ بیرونی عناصر کی داخلی عناصر سے مفاہمت کی کوشش۔ مصلحت پسندی تعصبات سے پاک ایک آزاد معاشرے کی خواہش کا اظہار۔

سرخ پتھر سے بنا ایک شہر۔ جو تعمیرات کی متنوع اشکال اور اٹھان کے باوجود گنجان نہیں لگتا۔ بلکہ کشادگی کا احساس دلاتا ہے۔ روایتی جتنوں سے نئی اقدار وضع کرنے کی کوشش۔ پرسکون مگر حقیقت پسند۔ لیکن یہ تعمیرات اور ان کی ترتیب ایسی ہے کہ اس کا کہیں بھی کوئی مرکز نہیں ہے۔ کوئی محور نہیں ہے۔ وہ خود کو آپ پر زبردستی حاوی نہیں کرتا۔ کہیں پر چونکاتا نہیں ہے۔ نہ وہ پورے کا پورا ایک ہی نظر میں سامنے آجاتا ہے۔ مگر آپ اس میں داخل ہو کر خود کو اس کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں اور وہ تہہ در تہہ آپ پر قدم بقدم عیاں ہوتا رہتا ہے۔ یہی فتح پور سیکری کے محلات اور درباروں کی تعمیراتی خاصیت ہے۔

مگر یہ عالی شان دارالحکومت ناقص منصوبہ بندی کی مثال ہے۔ پانی کی قلت اور میسر ہونے والے ناقابل استعمال پانی کی بنا پر اکبر اعظم نے حکم دیا کہ واپس آگرہ چلو۔ یہ جگہ رہنے کے قابل نہیں۔ یہ اتنے تردد کے بعد جب بے بہا رقم خرچ ہو چکی۔

بڑی عمارت کے باہر تالاب کے پانی میں کائی جمی تھی۔

ایک فقیر امریکی سیاح سے کہہ رہا تھا۔ انگریزی میں "آئی ایم ویری پور سر' مائی وائف از ویری سیک" ہندوستان کے فقیر بڑی اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ جیسے گداگری کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے انگریزی کا کورس پاس کرنا ضروری ہو۔ تاکہ مغربی سیاحوں کو اپنی غربت کی کہانی اچھی طرح سنائی جا سکے۔

اس وقت تیسری دنیا' ترقی پذیر دنیا' ترقی یافتہ دنیا کے سامنے شرمندہ ہو رہی ہوتی ہے۔

اکبر کو بیٹے کی دعا دینے والے بزرگ حضرت سلیم چشتی کے مزار کا مرمریں پتھر سرخ پتھر کی عمارتوں کے جلو میں تنہا تنہا مگر نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔

رات کے تقریباً آٹھ بجے تھے۔ میں اپنے ہوٹل کے قریب واقع ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں آبیٹھی تھی۔ ہوٹل کا مالک ایک بوڑھا ہندو تھا جو اپنے کاؤنٹر کے پیچھے درگا ماتا کی شبیہہ سجائے اونگھ رہا تھا۔ میں نے ایک تھالی کا آرڈر دیا۔ جب تک کہ تھالی بن سنور کر حاضر ہوتی میرا یہ ارادہ پختہ ہو چکا تھا کہ کل صبح کی بس سے کھجوراؤ کے لئے روانہ ہو جاؤں گی۔ ریسٹوران تقریباً خالی پڑا تھا کونے کی ایک میز پر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بل ادا کر کے جا چکا تو ریسٹوران میں بڑے لالہ جی اور ان کا ملازم رہ گیا تھا۔

ہندوستان میں تھالی کھانے کا بڑا مزہ آیا تھا چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں تھوڑے سے پیسوں میں بہت ساری چیزیں' دال' بھاجی' چاول' پاپڑ پوریاں۔ اچار۔ چٹنی۔

میں میز پر رکھی تازہ اور گرم گرم غذا سے اٹھتی ہوئی لذیذ لپٹوں سے محظوظ ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ بھلا میں نے ہندوستان آنے کا پروگرام اتنی دیر سے کیوں بنایا۔ امریکہ اور یورپ کے بعد اس کی سیاحت کا مزہ ہی اور ہے یہاں کی تہذیب' تمدن' اس کی ثقافت۔ مشرق کی ثقافت۔ ایسے جیسے سمندر کی زور دار لہر اٹھتی ہوئی آئے اور پل بھر میں آپ کا تن بدن بھگو دے اور اس کے جانے کے بعد بھی آپ مبہوت کھڑے سوچ رہے ہوں کہ یہ سب کیا تھا۔ جی چاہے کہ وہ لہر ایک بار اور آئے۔ پھر آئے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سردیوں کی رات گذار کر صبح پانچ بجے بس کو کھجوراؤ روانہ ہونا تھا اس پر سوار ہونا خاصا مشکل کام تھا۔ لیکن دیپک نے میری یہ مشکل حل کر دی تھی۔ وہ اپنا سائیکل رکشا لئے ساڑھے چار بجے وارد ہو گیا تھا۔ وہ جو آگرہ میں میرے قیام کے دوران میرے ہوٹل کے ارد گرد سائے کی طرح منڈلاتا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے دو طرح کا خیال آتا تھا۔ یہ ایک غریب شخص ہے۔ اسے روزی درکار ہے۔ لیکن اس شہر میں بے شمار سیاح آتے رہتے ہیں۔ یہ بھلا ہمہ وقت ادھر ہی کیوں رہتا ہے۔ مجھ سے بار بار پوچھتا تھا کہ میں کہاں سے آئی ہوں۔ صبح سویرے بس اسٹینڈ پر چھوڑتے وقت کہنے لگا کہ آپ اپنے ملک واپس کب جائیں گی۔ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اور کہا میں دو چار روز میں دہلی لوٹ جاؤں گی۔ اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا کہ میں اسے دہلی میں نوکری دلا دوں۔ لیکن اس وقت میرے بس میں یہی تھا کہ اتنے تڑکے آنے والے مزدور کو کم از کم اس قدر معاوضہ دے دوں کہ اسے دن بھر اپنی دہاڑی کی فکر نہ رہے۔

آگرہ سے کھجوراؤ پورے دن کا سفر تھا۔ میں نے قصداً بس کی پچھلی لمبی سیٹ کا انتخاب کیا تھا اور اپنے بیگ کو سر کے نیچے رکھ کر کونے میں دبک کر اونگھنے لگی تھی۔ آنکھ کھلی تو قریبی سیٹ پر دو نوجوان گورے بیٹھے نظر آئے کنڈکٹر نے ٹکٹ دیئے تو پتہ چلا وہ بھی کھجوراؤ جا رہے ہیں۔ ڈھارس بندھی۔ مقامی رنگ میں سیاحت کا رنگ مل گیا تھا۔ وہ دونوں آئیور اور وکٹر اپنی تعلیم مکمل کر کے ملازمت کے جھمیلوں میں پڑنے سے پہلے مشرق کی سیاحت کے لئے نکلے تھے۔ لمبا پروگرام تھا۔ وہ تین ماہ تک ہندوستان اور دیگر جنوب مشرقی ملکوں میں قریہ قریہ گھومنے کے ارادے سے نکلے تھے۔ دونوں کا تعلق لندن سے تھا۔

صبح صادق کی دودھیا روشنی آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی۔ بس اتر پردیش کی مسافتیں طے کرتی ہوئی مدھیہ پردیش کی طرف رواں تھی اتر پردیش ——— جسے عموماً یو پی کہتے ہیں۔ مجھ پر ہمیشہ سے یو پی کا بڑا رعب تھا۔ یہ رعب اپنے یو پی والے دوستوں نے وقتاً فوقتاً جھاڑا تھا۔ یو پی کی زرخیزی' سلیقہ شعاری' معاشرت رہن سہن رکھ رکھاؤ تعلقات و آداب۔ یہاں تک کہ ان کی دھات جیسی ٹھوس ثقافت

کے سامنے احساس کمتری بھی ہونے لگتا ہے۔ اس لئے یو پی کے کھیتوں کھلیانوں میں سے گذرتی ہوئی سڑک پر سفر کرنا بڑا پر تجسس تھا۔ راستے میں کچھ جھیلیں' ندیاں پڑیں۔ یوں بھی ایسی سہمی زندگی میں کبھی کبھار ہی آتی ہیں۔ ورنہ معمولات کی پابندی سے اوقات مختلف ہو جاتے ہیں۔ کبھی رات دیر سے ہوتی۔ کبھی دن کا آغاز سورج چڑھے ہوا۔ یو پی کی داستانوں کی زیبائی سے وہ علاقہ مجھے ایسا ہی اجنبی لگتا تھا جس کے ساتھ بے تکلف ہونا بہت مشکل ہو۔ لیکن ——— وہ کھیت' ان کی کچی مٹی کی بٹیں' چارخانے دار تہبند پہنے سر پر صافا باندھے کسان۔ سڑک کے کنارے کچے گھروں کے سامنے چارہ کھاتے بیل' جگالی کرتی ہوئی بھینسیں۔ یہ سب کچھ دیکھا بھالا۔ جانا پہچانا تھا۔ میدانی علاقوں کے کھیتوں کے منظر سندھ اور پنجاب کے کھیتوں جیسا۔ سوندھی سوندھی خوشبو والے کھیت کھلیان۔

بس گوالیار پہنچ کر رکی تھی۔ ابھی سویرا ہی تو تھا۔ مسافروں کی ریل پیل کا وقت نہیں ہوا تھا اڈے پر کھڑی بسوں کے کنڈکٹر جھاڑو پونچھ کر رہے تھے۔ جمعدار جھاڑو لگا رہے تھے۔ ایک کھوکھے میں آگ جل رہی تھی۔ چائے کی کیتلی چڑھی تھی۔ اتر کر ایک پیالی چائے اور کچھ کھانے کی تلاش کی۔ وہاں بلیسوں اور کچھ اسی قسم کی مٹھائی ہی دستیاب ہو سکی۔ چلو ٹھیک ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے وکٹر کو بسکٹ پیش کئے تھے جو اس نے تھینک یو کہہ کر لے لئے تھے۔ ایرک اپنے رک سک پر سر رکھے اونگھ رہا تھا ایرک نوعمر اور چھریرے بدن کا تھا۔ وکٹر موٹو اور خوش مزاج۔ لیکن وکٹر نے گوالیار کے بس اڈے پر بنائی جانے والی مٹھائی کھانے سے انکار کر دیا۔ اگر میں اس سے کہتی کہ تمہیں معلوم ہے' یہ مٹھائی اس شہر کی ہے جہاں تان سین نے حضرت غوث گوالیاری سے موسیقی کا پہلا سبق لیا تھا۔ تو وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوتا۔ نہ معلوم وہ تان سین کے نام سے واقف بھی تھا کہ نہیں۔ میں اسے بتاتی کہ تان سین ہمارا بیتھوفن اور متذارت ہے۔ اس نے وہ واقعہ بھی نہ سنا ہو گا کہ جب اس علاقے میں بارش نہ ہونے سے قحط پڑ گیا تھا۔ خشک سالی کا عذاب۔ سوکھے کھیت' کھلیان' بے برگ دیار پیڑ' خشکی سے چٹختی ہوئی زمین ——— روکھے ہونٹ ——— تان سین کے راگ سے بدلی گھر آئی اور جی بھر کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

بری تھی تانی کی محبت سے سرشار تان سین
گوالیار تان سین کی آخری آرامگاہ۔

ایرک جاگ گیا تھا اور اب وہ ایک کارڈ لکھ رہا تھا۔ شاید لندن میں اپنی گرل فرینڈ کے نام۔

ہماری اگلی منزل جھانسی تھی' جھانسی کی رانی کا شہر۔ راجاؤں مہاراجوں کا مسکن۔ لیکن وہ لوگ شہر کی عمومی زندگی سے خاصے دور ہوں گے جو ان کا کوئی نام و نشان دکھائی نہ دیا۔ جھانسی سے گذرے تو ویسے ہی لوگ وہاں نظر آئے جو ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں کام کرنے والے۔ سستے گھروں میں رہنے والے۔ سائیکلوں اور موٹر رکشاؤں میں سفر کرنے والے۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں کے عوام

دوپہر ہو گئی تھی۔ بس میں مسافر چڑھتے اترتے رہے۔ اب ان میں ایک جوڑا بھی شامل ہو گیا تھا۔ نوعمر' نوبیاہتا ہندوستانی بولنے والے۔ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے۔ سمجھتے سمجھاتے۔

بس مدھیہ پردیش میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دیہی منظر تبدیل ہو رہا تھا۔ سڑک کے کنارے کبھی کھیتوں کھلیانوں کی منڈیروں سے جا ملتے تو کبھی کسانوں کے چھوٹے چھوٹے گھر نظر آتے —— کچے اور اینٹوں کی دیواروں والے۔ انہوں نے چھتوں کی کھپریل کے لئے اپنی ہنرمندی اور جو وسائل دستیاب تھے' ان سے ضرورت پوری کی تھی۔ مٹی کی گول گول رکابیاں بنائیں اور پکا لیا۔ ان کی وضع ایسی جیسے گوبر کے اپلے۔ انہیں ڈھلوانی چھت پر اس طرح جوڑ دیا کہ بارش کا پانی بہتا ہوا نکل جائے اور وہ اس کے اندر محفوظ بیٹھے رہیں۔

موسم میں ہلکی سی تپش آ گئی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ کسی انجانی جگہ پر کچھ دیر کو بس رکی۔ سامنے ایک تنور پر روٹیاں پک رہی تھیں۔ تنور کے قریب کچھ پتیلیاں بھی رکھی تھیں۔ "یقیناً ان میں کچھ پکا کر رکھا ہو گا۔" ڈرائیور سے کہا کہ اگر وہ کچھ دیر کو بس روک لے تو میں کچھ کھانے کو لے آؤں ایرک بھی بس سے اتر آیا تھا۔ اسے پیاس لگی تھی۔ اس نے اپنے اور ڈکٹر کے لئے دو ٹھنڈی

بوتلیں خریدیں۔ ان دونوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ شاید وہ مشرق کے عام کھانوں میں شامل آلودگی سے بچنا چاہتے تھے۔ بھلے سے۔ رہو بھوکے۔ میں تنور کی طرف بڑھی۔ پتیلیوں میں کچھ دال اور کچھ سبزیاں بنی رکھی تھیں۔ میں نے اخبار کے کاغذ پر ایک گرم روٹی اور آلو مٹر کی بھجیا 5 روپے میں خریدی اور اپنی سیٹ پر آ بیٹھی۔ بس روانہ ہو چکی تھی —— واہ۔ اس تنوری روٹی اور بھجیا نے بڑا مزہ دیا۔ پیٹ بھرا تو سیٹ کی پشت اور بس کی دیوار کے درمیان بنے والے کونے میں دبک کر سو رہی۔ بس کے اندر اور باہر کیا کچھ ہوتا رہا۔ کچھ خبر نہ ہوئی۔

ایرک اور وکٹر خالی پیٹ اونگھ رہے تھے۔

نیا جوڑا اپنی اگلی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا ان کا حال بڑا آرام دہ اور خوش رنگ تھا۔

بس رک گئی۔ یہ کون سی جگہ ہے!! چھترپور —— محکمہ سیاحت کا نقشہ بتا رہا تھا کہ اب کھجوراؤ زیادہ دور نہیں ہے۔ زمین کچھ ناہموار اور پتھریلی ہو گئی تھی۔ تقریباً تمام مسافر اتر گئے تھے۔ ڈرائیور نے کنڈکٹر کو تیل پانی چیک کرنے کو کہا۔ ٹائروں میں ہوا بھری گئی۔ ٹینک فل کیا۔ اس سے ظاہر تھا کہ کھجوراؤ میں یہ تمام سہولتیں میسر نہیں ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

رات کے سات بجے تھے۔ کھجوراؤ کی ایک لاج کا بے چارہ سا کمرہ۔ میں نے لاج کی کنٹین سے کچھ دیر پہلے چائے منگوائی تھی' وہ شیشے کا گلاس خالی پڑا تھا۔ بہت ساری شکر ملا کر پکائی ہوئی چائے میں نے جیسے تیسے حلق میں انڈیلی تھی۔

آگرہ سے کھجوراؤ کا سفر پورے بارہ گھنٹے کا تھا شام پانچ بجے بس اسٹیشن پر اترے تو سامنے مختلف ہوٹلوں کے ریٹ لکھے دکھائی دیئے۔ فائیو اسٹارز ہوٹلوں سے لے کر لاجز تک۔ بہت ساری ٹھہرنے کی جگہیں۔ میرے ہم سفر سستی سے سستی جگہ پر رہنا چاہتے تھے۔ اگر یہاں کوئی سستی جگہ نہ ہوتی تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ کسی مندر کے تھڑے پر اپنا سامان سر کے نیچے رکھ کر سو رہتے۔ میں ان کے ساتھ ہو لی۔ اتنی ویران ویران سی' اور بہت ساری اجنبی جگہ پر نسبتاً کم اجنبی لوگوں کا ساتھ غنیمت لگ رہا تھا۔ لیکن جب ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک گھٹیا قسم کی لاج (Lodge) میں قیام کیا تو میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ کہ خوامخواہ ان لونڈوں کے پیچھے لگ گئی۔

اس بھٹیار خانے قسم کی لاج سے کسی ہوٹل میں قیام محفوظ اور زیادہ آرام دہ رہتا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ کمرے میں ایک چارپائی' اور میز کے سوا کچھ نہ تھا اور غسل خانے میں پانی کا نل غنیمت تھا۔ رہائشی کمرے اوپر تھے جبکہ نیچے کھانے پینے کا انتظام تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ وکٹر تھا۔ کہنے لگا —— "آپ کھانا کھانے نہیں چل رہیں کیا؟

ابھی جو میں تھوڑی دیر پہلے ان دونوں کی وجہ سے خود کو برا بھلا کہہ رہی تھی اور وہ دونوں مجھے ایک دم فضول لگ رہے تھے۔ اب مجھے وکٹر بہت اچھا لگا کہ

کتنا خیال کرنے والا ہے۔ اپنا اپنا سا۔ ہم تینوں نے لاج کے ریسٹوران میں بیٹھ کر تھالیاں کھائیں۔ دھات کے گلاسوں میں ڈھنڈا پانی پیا۔

ڈھلتی رات نے کھجوراؤ کے سارے بھید چھپا رکھے تھے۔ کھانا کھا کر سڑک پر ٹہلنے نکلے تو سامنے ایک کھلے میدان اور کھمبوں پر چالیس واٹ کے بلبوں کے علاوہ کچھ فاصلے پر مندروں کے ہیولے نظر آ رہے تھے جیسے پہاڑیوں کا ایک سلسلہ' جن کی چوٹیاں بلندیوں کی جانب نوکیلی ہوتی گئی ہوں۔ کونیکل ہلز۔

میرے ساتھ والے کمرے سے عورتوں' مردوں اور بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک مرد بچوں کو ڈانٹ رہا تھا۔ دوسرا عورت سے اپنے کپڑے مانگ رہا تھا۔ کچھ برتن کھنکے' دوسری عورت کہہ رہی تھی کھانا کھا لو۔ اوہ۔ یہ لوگ —— نہیں وہ سیاح نہیں تھے۔ یاتری تھے۔ پورے کنبے کے ساتھ براجمان تھے۔ جیسے کوئی منت اتارنے آئے ہوں۔

میرے کمرے میں بھی چالیس واٹ کا بلب لگا تھا۔ روشنی اس قدر کم تھی کہ کچھ پڑھنا لکھنا مشکل تھا۔ پڑوسیوں کے شور شرابے سے میرے بوسیدہ کمرے کا اکیلا پن البتہ کم ہو گیا تھا۔ مگر میں اس وقت تک جاگتی رہی جب تک وہ سب کے سب سو نہیں گئے۔

برہمن کی بیٹی ہیماوتی چاندنی رات میں جھیل رتی کے پانی میں نہا رہی تھی کہ چندر دیوتا چاند سے اترا۔ ہیماوتی کو گلے لگایا۔ اسے پیار کیا اور روانگی سے قبل ہیماوتی کو بتاتا گیا کہ وہ ایک ایسے بچے کو جنم دے گی جو ایک بہادر نسل کا بانی ہو گا۔ ہیماوتی نے ایک بچے کو جنم دیا جس نے چندل خاندان کی بنیاد رکھی۔

یہ ایک روایت ہے۔

کھجوراؤ کے مندر میری لاج سے اس قدر قریب تھے کہ صبح اٹھتے ہی' چائے پی کر' کیمرہ بیگ لٹکائے اس طرف چلدی۔ ایرک اور وکٹر پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔

مورنگ'

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہیلو' گڈ مارننگ۔

رات اچھی گذری۔

ہاں'

"آپ کیسے ہیں۔

ناشتہ کیا۔ اچھا۔

مندروں کی دیواروں سے چپکی ہوئی مورتیوں کے اعضا پر نظریں دوڑاتے دو سیاحوں کے درمیان گفتگو

مندروں کا وسیع و عریض احاطہ خالی خالی تھا۔ سوائے چند ایک مقامی لوگوں کے' عورتیں اور مرد یہ لوگ یقیناً پوجا پاٹ کے لئے یہاں آئے تھے۔

مگر ان مندروں کی ایکسرائیڈ مورتیاں!!

ایرونک۔ یہاں سے کوئی کمزور عقیدے والا شخص۔ کم از کم ذہنی اور اعصابی طور پر صحیح سلامت نہیں لوٹ سکتا۔ سطحی رائے۔ قدیم ہندوستانی فلسفے سے جانکاری نہ ہونے کی وجہ سے۔ کھجوراؤ کے عظیم الشان مندروں پر بنی نسائی اور مردانہ شبیہیں' مرد و عورت کا پرشوق ملاپ۔ سوائے عشق کی جھلکیاں۔ دراصل تنترا کے اظہار کا انداز ہے۔ تن —— سنسکرت کی زبان کا وہ نظم و ضبط ہے جس کے وسیلے سے علم کی توسیع مقصود تھی۔ تنترا کی ان زبانوں میں ایرونک رسوم' شاعری' مصوری' مجسمہ سازی اور کتھائیں شامل ہیں۔ اظہار کے کئی وسیلے' کئی طریقے'

کھجوراؤ ایک بے آب و گیاہ سرزمین ہے۔ پھر جہاں کہیں کچھ پانی میسر آیا تو کھجور اُگ آئے۔ نخلستان۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ برسوں پہلے اس دارالحکومت کے خوشحال زمانے میں شہر کے داخلی دروازے پر سونے کے درخت بنے ہوئے تھے۔ ایک مورخ کا خیال ہے کہ کھجوراؤ کے مجسموں کی یہ رنگین مزاجی تہذیب کے آغاز سے پہلے دور کی یادگار ہے۔ یعنی انسان نے اس وقت ستر پوشی اور آداب زندگی نہیں سیکھے تھے۔ ایک اور رائے —— بدھ مت کی تعلیمات۔ ضبط نفس —— تسخیر خواہش کا ردعمل —— تشہیر خواہش۔ اظہار تمنا' —— پتھر کی

زبان میں۔

میں نے کھجوراؤ آنے کی خواہش کی تو ہر کسی نے یہی کہا۔ کھجوراؤ کے مندروں پر بنی مورتیاں بہت فحش ہیں۔ لغو ہیں۔ ایرونک اور ہیجان انگیز ہیں وہ شدید جذباتی اشتعال ہے۔ میں اس روشن صبح مندروں کی طرف جاتے ہوئے ان آراء کی بازگشت سنتی ہوئی ایکسرائیڈ مورتیوں کو دیکھنے جا رہی تھی تو کیا ہوا۔ کیا بگاڑ لیں گی۔ دور سے مجھے یہ مندر گوتھک کیتھڈرل جیسے لگے۔ ہندوستان کے مدھیہ پردیش کی ایک دور افتادہ جگہ کا آرکیٹکچر' یورپ کے آرکیٹکچر سے کیسے مشابہ ہو گیا۔ شاید دونوں طرح کے فن تعمیر میں' ایک خواہش کو حقیقت کا روپ دینے والوں میں قدر مشترک' ان کی عقیدت اور عرق ریزی تھی۔ قدیم وقتوں کی بہت سی فراغت' محدود وسائل اور دستیاب مواد سے بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرنے کی آرزو۔

کھجوراؤ کے حکمرانوں کو شیو بہت پسند تھا۔ شیو' تین آنکھوں والا دیوتا۔ جو خالق بھی ہے اور غارت گر بھی۔ وہ اپنی تیسری آنکھ سے ہر شے کو اور ہر طرف دیکھتا ہے۔

ایرک اور وکٹر سب سے پہلے دور والے مندروں کی طرف جانا چاہتے تھے۔ میں نے معذرت کی۔ دیکھو تم لوگ ہو آؤ مجھ سے اتنی دور تک نہیں چلا جائے گا۔ وہ دونوں مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے چلے گئے۔ یہ جملہ سنائی دیا "اتنی دور سے یہاں تک آ گئیں اور اب ----!!" میں دراصل کچھ تصاویر بنانا چاہ رہی تھی۔ وہ مجھے ڈسٹرب کر رہے تھے۔

مورتیوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ مرد اور عورت ایک دوسرے میں پیوست ہونے کی کاوش میں مشغول۔ نہیں —— یہ دیوی اور دیوتا کا ملاپ ہے۔

فلیش بیک۔ وہ کہہ رہا تھا مجھے تصاویر کی اس پوری نمائش میں یہ تصویر اچھی لگی ہے۔ کیوں؟ اس کی کیا خاص وجہ ہے؟ بہت سی تصویروں کے اجزائے ترکیبی' ان میں رنگوں کا امتزاج خوبصورت ہے۔ پھر یہی کیوں!!

allurdupdfnovels.blogspot.com

اس میں برش کا یہ اسٹروک ایسے لگا ہے جیسے عورت کے جسم کا پر تو ہو۔ مصور نے اسے سوچ سمجھ کر عورت نہیں بنایا تھا۔ مگر وہ شبیہہ' عورت بنا دی گئی تھی۔ عورت سمجھ لی گئی تھی۔ کھجوراؤ کے مندروں پر سوچ سمجھ کر عورت و مرد کے جسم کی تشریحات بیان کی گئی تھیں۔ مگر وہ زن و مرد نہ تھے۔ زمینی اور آسمانی مخلوقات کے استعارے تھے۔ شیو اور پاورتی کا ملاپ دیوتاؤں اور دیویوں کا ملاپ۔ مادہ اور لاہوتی کا ملن۔

ایرک اور وکٹر تیز تیز قدم اٹھاتے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اور مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ بے چارے لڑکے اس ویران سی' اجنبی سی جگہ پر خوامخواہ میرے محافظ بننے پر آمادہ تھے پھر ان کا ساتھ مجھے بھی تو اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اب اتنے فاصلے پر تھے کہ اگر میں انہیں آواز بھی دیتی کہ "رکو" —— تو وہ سن نہ پاتے۔

انسان کا جسم کائنات کا خلاصہ ہے۔ تنترا فن کی یہی اساس ہے۔ اس کا اظہار مختلف رسوم کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ جس میں ہر دو اصناف پر اسرار قطعہ زمین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ متجسس' بے خود' پر اشتیاق پھر وہ ایک دوسرے کی اس طرح کھوج لگاتے ہیں جیسے یاتری کسی مقدس شرگلی کوچوں میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ تنترا شاعر مہارا نے اپنے جسم کا جغرافیہ معلوم کر لیا تھا۔

میں یاتریوں کے سنگ سنگ رہا
پوتر جگہوں میں گھوما پھرا
تو جانا
میرے جسم سے زیادہ
کوئی شے پاک نہیں۔
یہیں پر مقدس جمنا بہتی ہے۔
یہیں پر ہے گنگا ماتا۔
پریاگ اور بنارس بھی یہیں ہیں
یہیں پر ہیں چاند اور سورج۔

شیو' پاربتی کی مورتیاں بہت دور' ہزاروں سال پرے لے جاتی ہیں۔

میرے انگریز ساتھی اپنی سیاحت کا ایک مرحلہ ختم کر کے لاج کی طرف لوٹ رہے تھے۔ وکٹر کل شام مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "آپ مقامی عورتوں سے مختلف لگتی ہیں۔ اس لئے سب آپ کی طرف دیکھتے ہیں"

لیکن وہ امریکی عورت جو اپنے دوست کے ساتھ بیٹھی کھسر پھسر کر رہی تھی۔ وہ بھی تو مختلف دکھائی دیتی ہے۔ لیکن لوگ اس کی طرف نہیں دیکھتے۔ اس لئے کہ وہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ وہ جہاں جانا چاہے چلی جاتی ہے۔ اکیلی جانا چاہتی ہے۔ اس کی مرضی۔ وہ اپنے سیاہ سفید کی مالک ہے۔ مگر ہمارے ہاں کی عورت —— سرحد کے اس پار کی ہو یا اس پار کی۔ بات زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اول تو وہ زیادہ دور تک جاتی نہیں اور اگر ایسا کر بھی لے تو اپنے ساتھی' کا انتظام کر کے چلتی ہے۔ وہ کسی بھی روپ میں ہو۔ شوہر' عزیز' دوست' ابھی تک اس میں اجنبی جگہوں کا ٹکٹ خرید کر منہ اٹھائے چل پڑنے کا حوصلہ نہیں۔ جبکہ میں ایسا کر کے بہت لطف اندوز ہوتی ہوں۔

صدیوں پر محیط' موسموں کی شکست و ریخت سے دوچار ہونے والی مورتیوں اور مجسموں کی ہیئت بدستور مکمل ہے اور محفوظ بھی۔ بلکہ وقت کے ساتھ زردی مائل پتھروں کی کندہ کاری میں کئی رنگ مل گئے ہیں بھورے' فاختائی اور کائی کے سیاہی مائل سبز رنگ یوں وہاں خوبصورت کمپوزیشنز بنی تھیں۔ مجسمہ سازوں کی شکتی۔ ان کی کاریگری کی روشنی' وقت کے سایوں میں گھل مل کر مبہوت کر دینے والی تصویر پیش کر رہی تھی۔

"ہیلو"

کسی نے میری یکسوئی میں خلل ڈالا تھا۔ میں چونکی۔ "ارے آپ نمشکار" یہ کل والا نوبیاہتا جوڑا تھا۔ وہ ہنی مون منا رہے تھے۔ اپسراؤں کے جنگل میں۔ اندر کی جنت میں رقصاں اپسراؤں کے بھرے بھرے سینوں اور کولہوں سے محظوظ ہونے کے لئے آنے والا جوڑا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔ کھجوراؤ کا پورے کا پورا ماحول بڑا پر سکون تھا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

وہاں نہ کوئی شور تھا۔ نہ دھواں نہ ہی پٹرول کی بو۔ مندروں کے سامنے، سڑک پر سوونیئر فروخت کرنے والوں کی دوکانیں اور ریڑھیاں، دھات اور پلاسٹر آف پیرس کی بنی ہوئی مورتیاں۔

یکدم فضا میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ دہلی سے جہاز آیا تھا۔ یکایک ماحول تبدیل ہو گیا۔ اب وہاں کارڈیگن، پل اوور جینز اور جوگرز پہنے امریکی اور یورپی مرد اور عورتوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ریڑھی والوں نے مورتیوں کے دام بڑھا دیئے تھے۔ امیر ملکوں کے متمول خریدار غریب ملک کے غریب کاروباریوں پر دھونس جمانے آ پہنچے تھے۔

تیز رفتاری ان لوگوں کو ایک متعدی مرض کی طرح چپک گئی ہے۔ وہ اڑتے اڑتے نظارہ کرنے کے بعد گھر لوٹتے ہیں تو "دنیا گھوم آئے" کی بڑ مارتے ہیں انہیں خود بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا کھویا کیا پایا۔ آپا دھاپی میں ان کے ہاتھ کیا آیا۔

ایک ٹورسٹ امریکی عورت۔ وہیل چیئر پر ۱۱ یہ ایپرٹ خوب تھی۔ اسنے اپنی معذوری کو پسپا کر دیا تھا۔ خود ترسی کو قریب بھٹکنے نہ دیا تھا۔

میں نے سائیکل رکشا پر مشرقی گروپ کے مندروں کو اور قدیم کھجوراؤ گاؤں دیکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ہندو مت، جین مت، بدھ مت۔ ساری متوں کے مندر ساتھ ساتھ بنے ہوئے۔ اس وقت وہاں کوئی پجاری موجود نہ تھا۔ لیکن کبھی، آتے تو ہوں گے۔ یہ بھی ہوا ہو گا کہ گاؤں سے یا کہیں باہر کے شہر سے اکٹھے چلے اور یہاں آ کر اپنے اپنے مندروں میں چلے گئے۔ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کو۔

شہر کی بڑی سڑک پر سے عاشورہ کا جلوس گذرنے والا ہے۔ ہاں تو کیا اسے گذرنا ہے۔ گذرنے دو۔ نہیں یہ غلط ہے۔ نہیں گذرنے دیں گے جلوس کے آگے آگے بالٹیاں اٹھائے جنونی تحریک کے ارکان دیواروں پر نعرے لکھتے جاتے ہیں کہ ماتمی جلوس کے ارکان کسی نہ کسی طور مشتعل ہو جائیں۔ فساد برپا ہو اور وہ اپنی فنڈنگ ایجنسی سے خراج و شاباش حاصل کر سکیں۔

کھجوراؤ میں وقت رکا ہوا تھا۔ جین اور بدھ مت، اور ہندو مندروں کی قربت اور قوت برداشت سے مرعوب ہوتی ہوئی اپنی قیام گاہ کی طرف واپس ہوئی تو ایک بوڑھا کمہار مٹی کے برتنوں کی قطار لگانے میں مشغول دکھائی دیا۔ رکشا رکی کیمرہ نکالا۔ تصویریں بنائیں۔ وہ قطعی نہیں ہوا۔ نہ میری اس حرکت پر کوئی ردعمل ظاہر کیا بس خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ آہٹ پر چونکا تک نہیں رکشا والا گاؤں کی گلیوں میں سے گھومتا ہوا ایک مکان کے سامنے رک گیا تھا۔

"میم صاحب آپ کو اصلی جیولری خریدنی ہے تو اندر چلی جائیں"

ارے جیولری تو میرا موضوع ہی نہیں۔ چلو تمہاری مرضی۔ ایک نوعمر، بھرے بھرے جسم کی لڑکی۔ ساڑھی پہنے، بندیا لگائے۔ مجھے دیکھ کر ذرا سا مسکرائی۔ چاندی کی پازیبیں، گلوبند، کڑے، انگوٹھیاں —— نکال کر دکھائیں۔ دام بہت زیادہ لگے۔ شاید اس لئے بھی کہ مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ منتظر تھی کہ میں بھاؤ تاؤ کروں۔ انگریزی بول رہی تھی۔ میں نے اس سانولی سلونی بیوپارن سے معذرت چاہی۔

گلیوں میں ننگے پاؤں کھیلتے ہوئے بچے، مزدوری کر کے لوٹنے والا بوڑھا جو کندھے پر تھیلا لٹکائے اپنی راہ پر چلا جا رہا تھا۔ کھوئی (چھوٹا کنواں) سے ڈول کھینچ کر پانی بھرتی نمیار، ان لوگوں کا جیسے، کھجوراؤ کے مندروں، شاہانہ ماضی کے جاہ و جلال، سیاحوں کے تجسس سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہ تھا۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ لنک روڈ پر لمبی چہل قدمی کی۔ کچھ وقت میوزیم میں گذارہ، جو مجسمے کسی وجہ سے اپنے اصل مقام پر نہ رہ سکے۔ توڑ پھوڑ دیئے گئے تھے انہیں اس میوزیم میں محفوظ کر لیا گیا۔ شیو ساگر —— ایک جھیل۔ سورج کی شفق جھیل کے پانی میں اتر آئی تھی۔ وہ خود بھی آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔ کبھی جھیل کے کنارے ترشول اور ڈگڈگی کے ڈیزائنوں والے لوہے کے جنگلے کے اندر سے جھانکتا ہوا۔ کبھی پیڑوں کی شاخوں کی آڑ سے چتوں میں سے چھینٹا ہوا۔ دور ایک ناؤ میں دو سائے نظر آ رہے تھے۔ کون تھا۔ ہو گا کوئی جوڑا۔ وعدے وعید کرتا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

ریسٹوران کے مالک لڑکے نے مشورہ دیا تھا کہ سورج چھپنے کے بعد مندر میں آرتی اور بھجن سننے ضرور جائیں۔ میں نے وکٹر اور آئیور کو بھی بتا دیا تھا وہ ایک خوبصورت رسم تھی۔ پنڈت جی نے ہمیں پرشاد دیا ہمارے ماتھوں پر سیندور کے تلک لگائے۔ لڑکیاں جو تھال میں موم بتیاں سجا کر آرتی اتارنے آئی تھیں اور منہ کھول کھول کر بھجن گا رہی تھیں وہ پنڈت جی سے بہت مرعوب لگ رہی تھیں۔ بھجن ایسے گا رہی تھیں جیسے ڈیوٹی دے رہی ہوں۔

شیولنگ کو کانٹے دار تاروں میں جکڑ دیا گیا تھا اور اس پر ایک بڑا سا ترشول پہرہ دے رہا تھا۔ پنڈت جی نے شکایت کی بہت زمانے پہلے مسلمان حملہ آوروں نے شیولنگ کو نقصان پہنچایا تھا اس لئے اب اس کی پوجا نہیں کی جاتی۔ اب وہاں بانجھ عورتیں منت نہیں مانتیں۔

میں نے لاج کے مالک کو بل بنانے کا کہا۔ میرا ارادہ صبح کی پہلی بس سے دہلی واپسی کا تھا۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ میرے انگریز دوست مندر میں آرتی کی ویڈیو بنا کر اب ایک اونچی لمبی بھورے بالوں والی امریکی لڑکی سے باتوں میں مصروف تھے۔ وہ لوگ ایک دو روز کے بعد بنارس جانا چاہتے تھے وہ سیاح لڑکی دوپہر کی فلائٹ سے دہلی سے آئی تھی۔ تینوں کچھ اس طرح محو تھے کہ انہیں خبر نہ تھی کہ لاج کی ریسپشن کے قریب خاکی وردی والا جو آ کر بیٹھا تو لاج والے کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ ادھر سے ادھر بولایا پھر رہا تھا۔ جیسے اسے خوش کرنا چاہتا ہو۔ اس کی خوشامد کر رہا ہو۔ اس سے ڈر رہا ہو۔ وہ وردی والے کے لئے اچھی سی تھالی بنوا رہا تھا۔ بہت اچھی۔ اس لئے وہ مسافروں کے آرڈر کی پروا نہیں کر رہا تھا۔

صبح چار بجے آنکھ کھل گئی۔ رات کی تاریکی بدستور گہری تھی۔ مجھے بس لینے کے لئے میلہ میدان کو عبور کرنا تھا۔ اس جگہ دن کے وقت رنچھ کا تماشا ہو رہا تھا۔ میں کندھے پر بیگ ڈالے تیز تیز قدموں سے بس اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سب سو رہے تھے۔ گاؤں والے۔ سیاحت کو آنے والے۔ ہوٹل والے۔ وردی والے۔ شیو۔ لکشمی۔ الپسرائیں

بس کھڑی تھی۔ کنڈکٹر نے گاڑی کا تیل پانی چیک کیا اب وہ مطمئن سے کان لپیٹے مسافروں کے انتظار میں ایک سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ڈرائیور!! ——— ارے یہ کیا۔ کھجوراؤ میں۔ اس ویران ویران سی جگہ پر ابھی تو پو بھی نہیں پھوٹی تھی۔ کانوں میں آواز آئی۔ اللہ اکبر۔ بس کا ڈرائیور ایک ادھیڑ عمر باریش مسلمان تھا۔ اس علاقے میں دور دور تک کوئی مسجد نظر نہ آتی تھی اس نے گھڑی دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔

"ہاں نندلال ——— ٹائیروں کی ہوا چیک کر لی"

جی میاں جی۔ سب ٹھیک ہے"

اب میاں جی بس اسٹینڈ کے برآمدے میں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے اب ایک دو مسافر اور بھی آ گئے تھے۔ اجنبی ماحول میں ایک مانوس آواز سے میرے دل سے وہ انجانا خوف نکل گیا تھا جو لاج سے یہاں تک میلہ میدان سے گذرتے ہوئے پریشان کرنے لگا تھا۔ میاں جی نے نماز کے بعد تسبیح پڑھی۔ پھر دعا مانگی اور بس اسٹارٹ کرتے وقت بسم اللہ پڑھی

ہندو مسلم فسادات۔ بابری ایودھیا کا قصبہ وہ سب اپنی جگہ۔ اہم خبریں بناتے ہیں۔ لیکن وہ کچھ جو میں نے دیکھا تھا۔ ایک حقیقت تھی۔

مجھے جھانسی سے دہلی کے لئے ٹرین لینی تھی جھانسی پہنچنے میں بڑی دیر تھی۔ میں کبھی اونگھنے لگتی تو کبھی رات بھر شبنم میں نہائے ہوئے گندم کے کھیتوں کو دیکھتی۔ صبح سویرے چوگا تلاش کرنے کی خاطر اپنے نرم و گرم گھونسلے چھوڑنے والے پرندوں کی اڑان ——— ندی کے کنارے مسواک کرتا ہوا ایک دیہاتی ——— دن چڑھتا گیا۔ کاروبار چلنے لگا۔

دو لڑکے بہتر مستقبل کے آرزومند۔ لیکن بڑے صابر ایک کہہ رہا تھا۔ میں اس سال انجینئرنگ کا امتحان پاس کر لوں گا۔ پھر تو کوئی بات نہیں گیارہ بارہ سو کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔ انجینئرنگ کے بعد ——— گیارہ بارہ سو کی نوکری۔!!

جھانسی ریلوے اسٹیشن پر:۔ "دہلی کے لئے ٹرین کب تک آئے گی۔" میرا سوال بکنگ کلرک سے۔ اس نے عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا۔ گھڑی دیکھی اور

allurdupdfnovels.blogspot.com

بس دس پندرہ منٹ میں آنے والی ہے۔ "اچھا ـــــ ایک ٹکٹ دہلی کے لئے"

"ہوں۔"

وہ بدستور رجسٹر میں کچھ لکھتا رہا۔ ارے بابا۔ جلدی کرو۔ تم نے خود ہی کہا ہے ٹرین آنے والی ہے۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں نے سو روپے کا نوٹ دیا۔ ٹکٹ 65 روپے کا تھا۔ وہ کہنے لگا میرے پاس چینج نہیں ہے۔ میرے پاس بھی نہیں ہے۔ تم ٹکٹ دو۔ "ہوں۔ دیکھتا ہوں۔" پانچ منٹ وہیں لگ گئے۔

ہندوستان کا کلرک طبقہ بہت ایذا رساں ہے ایک دم سیڈیسٹ۔ وہ لوگ اپنے کاؤنٹر کی دوسری طرف کھڑے ہونے والے کا صبر آزماتے ہیں اس سے اپنی محرومیوں کا انتقام لیتے ہیں۔ وہ چاہے بمبئی ایئرپورٹ کا کسٹم کاؤنٹر ہو۔ تاج محل ہوٹل کے عقب میں واقع ڈاک خانے میں بیٹھا ہوا یا جھانسی ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ گھر میں۔ اس کے پاس چینج تھا۔ اس نے صبح سے دس' پندرہ اور بیس بیس کے نہ جانے کتنے ٹکٹ فروخت کئے تھے۔ مگر عادت سے مجبور تھا وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ تم جو ٹکٹ خریدنے کی غرض سے میرے روبرو پیش ہوئی ہو تو کچھ دیر ادھر ہی اسٹیشن رہو۔

دہلی جانے والی ٹرین کے اس ڈبے میں بڑی بھیڑ تھی۔ ٹرین منہ اندھیرے کھجوراؤ سے چلی تھی۔ اب دوپہر ہونے لگی تھی ـــــ بنا کچھ کھائے پیئے۔ مجھے صرف اتنی مہلت مل سکی تھی کہ پلیٹ فارم کے ایک خوانچے سے پوریاں اور آلو چنے کی بھجیا خرید سکوں۔ پیپل کے پتے پر چنے اس کے اوپر چار پوریاں پھر ایک اور پیپل کا پتہ اخبار کے کاغذ پر بہت سارا دھاکہ لپٹا ہوا۔ میرا یہ لنچ کیریر میرے بیگ میں تھا مگر کہیں بھی اتنی جگہ نہ تھی کہ بیٹھ سکوں ایک کونے میں چار پانچ سردار جی۔ ان کے ہمراہ ایک 8 دس برس کا بچہ۔ آدھا سکھ۔ ڈاڑھی مونچھ نکلے تو پورا سکھ ہے۔ ابھی تک تو اس کے کیس بھی نابالغ تھے۔ مگر اس نے مخصوص انداز میں پگڑی باندھ رکھی تھی۔ ایک سردار جی نے مروت برتی اور مجھے بیٹھنے کو جگہ

دے دی۔ میں نے یہ جانچ پڑتال کئے بنا کہ اس ریل گاڑی میں کوئی زنانہ ڈبہ ہے کہ نہیں جو ڈبہ سامنے رکا اس میں سوار ہو گئی تھی ـــــ البتہ بہت سارے مردوں میں چند ایک زنانیاں بھی تھیں۔ چلو ٹھیک ہے۔ چلے گا۔ میں نے بالائی سیٹ پر نظر دوڑائی۔ اگر وہاں پر موجود سامان کھسکا دیا جائے تو خاصی گنجائش نکل آنے کا امکان تھا۔ کسی نہ کسی طور اوپر چڑھ گئی۔ اپنا بیگ کھولا۔ کھانا کھایا۔ مگر اب پانی۔ بڑی حماقت کی تھی۔ پلیٹ فارم سے کوئی گلاس ہی خرید لیا ہوتا۔ ہندوستان میں تو ویسے بھی "جوٹھے" کا بہت چکر ہے۔ کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ میرے ہمسفروں کو میری پیاس کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنے ٹیفن نیس گلاس میں مجھے پانی پیش کیا۔ شکریہ۔ شکریہ دھنیہ باد۔ آپ لوگ بڑے مہربان ہیں۔ میں نے سر کے نیچے بیگ رکھ کر آنکھیں موندھ لی تھی۔

دلی ابھی بہت دور تھی۔

سردار جی کے ٹولے میں بہت سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ لوگ نہ جانے کہاں سے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک سونیڈ بونیڈ اور بڑے سوفیسٹیکیٹڈ سے عزیز ـــــ جو ڈاکٹر تھے اور کینیڈا سے آئے تھے بڑے سردار جی ان سے اپنے منصوبوں کا ذکر کر رہے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کو ضرور پڑھائیں گے۔

اس وقت چھوٹا لڑکا ریل کی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا ـــــ اس نے اپنے بڑوں کو دیکھا اور پوچھا ـــــ

"اپنا علاقہ شروع ہو گیا کیا؟" بھری گاڑی میں سب کے سامنے ـــــ "اپنا علاقہ" لو۔ سارا قضیہ ہی اس بات کا ہے۔ باپ نے بیٹے کے سوال پر جھٹ سے کہا۔ "پتر سارا علاقہ ہی اپنا ہے"

بات پھر بیٹے کی پڑھائی پر آ گئی ـــــ ایک شخص نے منطق جھاڑی ـــــ پڑھائی اچھی چیز ہے۔ لیکن یہ نہ ہو کہ "چولہے میں گھاس اگ آئی" میں ریل کے ڈبے کی بالائی منزل پر لیٹی اس جملے پر غور کر رہی تھی۔ خاصی گہری بات ہے۔ اس کی وضاحت پوچھی نہیں جا سکتی تھی۔ خواہ مخواہ کا دخل در معقولات ہوتا۔ وہ لوگ اپنے مستقبل کے پروگرام بنا رہے تھے۔ یہ تو بہت گڑبڑ بات تھی کہ پوچھیں کہ یہ "

allurdupdfnovels.blogspot.com

چولہے میں گھاس ---؟اس کا مطلب کہیں یہ تو نہیں کہ پڑھائی کے چکر میں اپنا آبائی کاروبار ٹھپ ہو جائے اور چولہا ٹھنڈا پڑا رہے۔ یا یہ کہ اپنا آپ بھلا دو۔ اپنی روایات چھوڑ دو ——؟

یہ لوگ راستے میں نہ جانے کہاں اتر گئے۔ اپنے کسی علاقے میں۔ مجھے تو تب خبر ہوئی جب ٹرین دہلی شہر میں داخل ہو چکی تھی۔

فضا میں موسیقی گھلی تھی۔ کتھک' بھارت نیتم آرتی۔ فیسٹیول' —— جے شری' نہیں اسے میں اس کے سسرالی نام سے پکارتی تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے میرے منہ سے اپنا پرانا لڑکپن کا نام ہی پسند تھا۔ ہاں تو جیسو کی کسی دوست کی شادی کی سالگرہ تھی۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے گوشت پکایا تھا اور تاکید کی تھی کہ اپنی گوشت خور دوست یعنی مجھے ضرور لے کر آئیں وہاں صرف قریبی رشتے دار اور دوست مدعو تھے۔ تھال میں شمعوں کی جگمگاہٹ اور جھلملاہٹ۔ دونوں میاں بیوی کے سروں پر سے اس تھال کو وارا گیا۔ انہیں گیندے کے ہار پہنائے گئے۔ تحفے دیئے گئے۔ یہی آرتی کی رسم تھی۔ ودھائی کہ تم دونوں میاں بیوی جگ جگ جیو۔ پوتوں پلو۔

سابیتا کلاپریشاد کے زیر اہتمام کمانی آڈیٹوریم میں میوزک ڈانس فیسٹیول ہو رہا تھا۔ اس خوبصورت موقع سے فائدہ اٹھانے کی خواہش کے تحت میں نے انوپا کو ساتھ چلنے کو کہا انوپا اس ضمن میں بہت سپورٹنگ تھی۔ جھٹ سے تیار ہو جاتی۔ لیکن یہی کہ ٹکٹ ملیں تبھی تو۔ کمانی آڈیٹوریم کے سامنے خاصا رش تھا۔ کچھ لوگ جو پہلے سے ٹکٹ لے چکے تھے وہ کامران و شادمان آڈیٹوریم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہاں کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی کہ ہمیں اپنی تگ و دو کا کوئی پھل مل سکے۔ مایوس ہونے کی بات نہیں پھر قسمت آزماتے ہیں۔

"سنیں۔" میں نے اپنا پریس کارڈ آگے بڑھایا

"اوہ! آپ کراچی سے آئی ہیں۔ جی آیئے۔" اور اس نوجوان نے مجھے

اور انوپا کو بڑی آؤ بھگت کے ساتھ اگلی قطار سے دوسری میں جا بٹھایا۔

"جی نہال ہو گیا۔ اتنی عزت تو ہمیں اپنے شہر میں بھی شاذ و نادر ہی ملتی ہے" یہ کوئی پہلا تجربہ نہ تھا۔ ہر جگہ ایسے ہی لوگ ملے تھے۔

ہال میں ایک تقدس کا رچاؤ تھا۔ گیندے کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک' اگربتیوں کے مرغولے تہذیب و روایات کی سنگت بھنگناتی ہوئی خاموشی پردہ اٹھنے کا انتظار۔ دھیمی دھیمی سرگوشیاں کہ کہیں کسی کی بلند آواز سے شام کے اس روپ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ پھر وہ شام جس کا آغاز چراغ جلانے کی رسم سے ہوا تھا اس میں پنڈت ہری پرشاد چورسیا کی بانسری کی لے یوں اٹھی کہ روشنی کی کرنیں اپنا استحکام بھول گئیں اور بے اختیار ہو کر جھومنے لگیں۔ گوپال شری کرشن کی بانسری سے چوپائے بھی مسحور ہو جاتے تھے۔ پنڈت ہری پرشاد کی بانسری۔ روایت' عقیدت اور جدت کا حسین امتزاج۔ کماری شوبھا نیدو کا کچی پوری رقص۔

کلیو بیل نے کہا —— فن روح کی ضرورت بھی ہے اور اس کی پیداوار بھی —— شوبھا کی پائل کی جھنکار برسوں کی ریاضت کا عکس۔ دور ویرانے میں رات ڈھلے' ساحل سمندر پر' آتش بازی کا ایک منہ زور بگولا اٹھا' بکھرا' اور روشن ذروں نے پوری فضا کو منور کر دیا —— شوبھا کی وارفتگی کو طبلے کی تھاپ نے مزید اشتعال دلایا تھا۔ اس سحر انگیز شام میں استاد نثار حسین خان کا خیال اور ترانہ۔ ایک فن جو نسل در نسل پنپتا رہا۔ رامپور اور سہاسوان گھرانوں کی فن کاری کا ملاپ ایک منفرد انداز۔ اب پرتاب اور پریا پور کی باری تھی۔ کتھک اوڈیسی رقص۔ برجو مہاراج کے شاگرد جوڑے نے سماں باندھ دیا۔

اس روز کنیڈرا کتھک فیسٹیول منعقد ہو رہا تھا۔ کنیڈرا کو ہندوستان کے قدیم رقص کو جدید دور میں زندہ رکھنے کی بدولت کتھک کا مندر کہا جاتا ہے۔ نبادن مہاراج' کتھک کا بادشاہ۔ شاعر' استاد' برہمن' رقاص' فن زندگی' فن عبادت' فن وسیلہ معاش۔ نبادن مہاراج نے جہاں ہزاروں شاگرد پیدا کئے وہاں ان کا فن ان کے بھتیجے برجو مہاراج میں ایسے منتقل ہوا ہے جیسے ماں کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ۔ جیسے ماں اور بچے کا خون ایک ہوتا ہے۔ جیسے وہ ایک ساتھ سانس

allurdupdfnovels.blogspot.com

لیتے ہیں۔ جیسے —— جب بچہ ماں کی چھاتی سے دودھ پیتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کے وجود میں مدغم ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مگر بچہ ماں کی چھاتی سے غذا پا کر نشوونما کے سال گذارتا ہے۔ بڑا ہو جاتا ہے۔ اپنی پہچان کرواتا ہے۔

فروری کا دوسرا ہفتہ شروع ہو گیا تھا۔ مجھے ہندوستان آئے ہوئے تین ہفتے ہو گئے تھے۔ بڑے خوبصورت' مہمات سے پر تھے یہ تمام دن۔ ایک بے لگام مسافر کی سیاحت۔ اپنے آپ کو وقت کے دھارے میں بہائے لئے جانے کی آرزو کی تکمیل۔ بڑا مزہ تھا اس آوارہ گردی میں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تمنا تھی کہ جن لوگوں کے بارے میں سنا اور پڑھا ان سے ملاقات ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ پھر جب امرتا اور ان کے جیتی سے ملاقات ہوئی تو ایسے لگا کہ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

حوض خاص میں مجھے امرتا پریتم کے گھر کی تلاش تھی۔

"جی میم صاحب" —— ایک سوٹیڈ بوٹیڈ جوتشی میری طرف بڑھا۔

"میم صاحب۔ قسمت کا حال بتاؤں گا۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"یس میم صاحب"

"نو تھینک یو!"

ارے بابا —— مجھے اس کے گھر کی تلاش ہے جس نے رواجوں سے ٹکرا کر اپنی قسمت خود بنائی ہے۔ مجھے آج اس سے ملنا ہے —— تم جاؤ —— اتنے میں وہ اتنی دور جا چکا تھا کہ مجھے اس کی پشت گلی کے موڑ میں گم ہوتی نظر آئی۔

امرتا پریتم کی تحریریں۔ ہر بات' سچ بات بے باکی سے کہہ دی۔ زندگی کے کسی فیصلے کے غلط ہونے کا تاسف نہیں۔ اپنے کسی اقدام پر شرمندگی نہیں۔ مجھے اس امرتا سے ملنا تھا۔ امرتا کی تصویریں۔ ساحر کے ساتھ کھڑی ایک لڑکی۔ اپنے آپ میں گم۔ نوعمری کی محبت کی سرشاری۔ سن 38ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں پروگرام کرتی ہوئی۔ ستار بجاتی ہوئی امرتا۔ پرعزم' فعال' چہرے پر رکی ہوئی مسکراہٹ' متانت جاذبیت۔

حوض خاص کے ایک مکان کی پہلی منزل میں جو امرتا پریتم میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ زندگی کی ہموار گھاٹیوں کو پار کرنے والی' بقول ان کے "انسان حادثوں سے بڑا ہوتا ہے۔" امرتا بھی بہت بڑی ہو گئی تھیں۔ کہ ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے یہ لگا کہ یہ باتیں ہوتی رہیں۔ وہاں سے اٹھنے کو من نہ کرے۔ اگر اٹھ جانا ضروری ہے تو پھر کب —— !! آپ پاکستان کیوں نہیں آتیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ وہاں آپ کے کتنے پرستار ہیں۔ آپ کی ہر کتاب اردو میں ترجمہ ہو کر وہاں چھپ جاتی ہے۔ رسیدی ٹکٹ نے ادبی حلقوں میں بڑا ہنگامہ مچایا تھا۔ کسی نے کہا یہ شعر کی طرح پڑھی جانے والی نثر ہے۔

اچھا میں چلتی ہوں۔

"نہیں۔ تم ابھی رکو۔ جیتی آتے ہی ہوں گے۔

تم ان سے ضرور مل لو۔"

امرتا کے جیون ساتھی —— نبا راہداری کے اندر جیت۔ امروز۔ دونوں ایک گھر میں رہتے ہیں۔ امرتا کے نیچے نچلی منزل میں۔ اسی گھر کی۔ امرتا اور جیتی۔ دونوں خود مختار۔ اپنی اپنی زندگیاں گذارتے ہیں۔ اتنے دور کہ ہر صبح ایک دوسرے کے نام خط بھیجتے ہیں۔ اتنے قریب کہ وقت کی چاپ ایک ساتھ سنائی دے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر مکمل۔

امروز مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑنے آئے۔ یہی کوئی گھنٹہ بھر پہلے ملے تھے۔ لیکن میں بار بار تاکید کر رہی تھی کہ آپ کراچی ضرور آئیں اور وہ اس وقت تک رکے رہے۔ باتیں کرتے رہے جب تک میری بس نہ آ گئی۔ جیسے وہ مجھے شام ڈھلے بس اسٹاپ پر اکیلی کو چھوڑ کر چلے گئے تو یہ ان کی کوتاہی ہو گی۔

ہندوستان جاؤ یا نہ جاؤ۔ اس کے بارے میں دو باتیں ضرور پتہ چلتی ہیں۔ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ایک وہی سردار جی کے بارہ بجنے والی بات۔ اور دوسری یہ کہ لالہ جی بڑے کنجوس ہوتے ہیں۔ بمبئی سے دہلی آتے ہوئے' ریل ایک اسٹیشن پر رکی۔ ایک سردار جی ریل کے رکتے ہی اس طرف منہ کر کے کھڑے ہوئے اور پھر چل دیئے جدھر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ مجھے مذاق سوجھا کہا سردار جی آپ

allurdupdfnovels.blogspot.com

الٹے جا رہے ہیں۔ وہ فوراً مڑے لیکن ذرا بھی نہ مسکرائے۔ میرا مس فائیر ہو گیا۔ کیا تھا تھوڑا سا مسکرا کر میرا جی خوش کر دیتے۔

یہ دونوں سنی سنائی باتیں' سو فیصد نہ سہی کبھی کبھار' درست ثابت ہو جاتی تھیں۔ آپ لالہ جی کی کنجوسی کہیں یا کفایت شعاری —— یہ ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ ٹھاٹھ باٹ پر فخر نہیں کرتا۔ فضول خرچی کو جرم تصور کرتا ہے۔ جب کہ مسلمان خوب کھاتا ہے۔ شان و شوکت سے رہتا ہے۔ شاہ خرچی کی ڈینگ مارتا ہے۔ "کھاؤ پیو عیش کرو" کا نعرہ لگاتا ہے۔ اب یہی کہ ہندوستان میں دہلی ہو یا بمبئی' ٹیکسی والا ہو یا ذاتی گاڑی کا مالک' ٹریفک کی لال بتی دیکھ کر اپنی گاڑی فوراً بند کر دیتا ہے اور زرد بتی کے ساتھ سیلف مار کر سبز بتی پر گاڑی اسٹارٹ کرتا ہے۔ یہ کبھی' کسی نے کراچی لاہور میں یا کہیں بھی ایسا نہیں کیا ہو گا۔ ہماری ٹریننگ ہی اور طرح کی ہے کہ بتی سرخ ہو جائے تو گاڑی نیوٹرل کر کے زور زور سے ایکسلیٹر دباتے ہیں کہ کم بخت بتی ہری ہی نہیں ہوتی۔

فہمیدہ کو ڈیلی ہیڈی اوٹ کے دفتر میں کچھ کام تھا۔ میں جھٹ سے اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی جب سے دہلی آئی تھی کسی انڈین جرنلسٹ سے ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ خیر ایسا تو پھر بھی نہ ہو سکا۔ البتہ ہیڈی اوٹ اور انڈین ایکسپریس کے دفاتر میں اپنے اپنے کاموں میں مگن اخبار نویس ضرور دیکھے۔ ہیڈی اوٹ کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ڈپٹی چیئرمین ڈی چوپڑہ نے ایک کتاب مجھے دی۔ پاک و ہند تعلقات کا تحقیقاتی مطالعہ۔ دہلی میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کا مجموعہ جس میں دونوں ممالک کے اہل نظر شریک ہوئے تھے۔ چوپڑا جی نے کتاب کا تعارف لکھتے ہوئے' بین المملکتی تعلقات کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے وقت یہ لکھا کہ ہندوستان اپنے پڑوسی ملک پاکستان کی خود مختار مملکت کو تسلیم کرتا ہے اور دوستانہ' پرامن اور مستحکم تعلقات کا متمنی ہے۔ دونوں ملک یہی چاہتے ہیں۔ مگر ابھی کشمیر کے تنازعہ کے نمٹنے کی صورت پیدا نہ ہوئی تھی کہ بابری مسجد کے انہدام نے اور انتہا پسندوں کی تخریب کاری نے بہت سارا بگاڑ ڈال دیا۔ بمبئی میں بڑے پیمانے پر مسلم کش فسادات!!

پھر اشکبوئل سطح پر کئے گئے مذاکرات بے معنی معلوم ہونے لگتے ہیں۔

دہلی پنجابی اکادمی کی شام افسانہ تھی۔ فہمیدہ کو اس میں شرکت کرنی تھی۔ فہمیدہ نے وہاں میرا تعارف کروایا۔ لیکن کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میزبان تارا سنگھ لطیفہ سنا رہے تھے۔ بلکہ یہ ایک سچا واقعہ تھا' کسی کانفرنس کا۔ کچھ روسی مندوبین آئے تھے۔ روسیوں کے نام کے آخر میں عموماً وی (یعنی دوستوسکی۔ ٹالسٹائی' گورکی) تو آتا ہی ہے لیکن خوف اور چوف بھی ہوتا ہے۔ جیسے چیخوف' گوربا چوف یا شولوخوف۔ میزبان کی سمجھ میں کسی روسی کا پورا نام نہ آیا تو انہوں نے مخاطب کیا کہ "اب میں مسٹر "خوف" کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اس طرح فہمیدہ جی نے اپنی دوست کا کچھ نام لیا تھا۔ وہ پورا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے میں "روخ" جی کو خوش آمدید کہتا ہوں (وہ یہ سب پنجابی میں کہہ رہے تھے) اور انہیں اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دیتا ہوں۔

اپنے آباؤ اجداد' ماں باپ' سب پنجابی۔ نس' نس میں یہ زبان رچی ہوئی لیکن زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ برسوں کی کنڈیشنگ کے بعد میری یہ "مادری زبان" میرے گھر اور ذاتی حلقوں میں اظہار کے لئے رہ گئی ہے۔ میں بہت چاہنے کے باوجود پنجابی میں خطاب نہ کر سکی۔ میری تحریر و تقریر کی زبان صرف اردو ہے' میرے وفاق کی زبان۔ میرے کیریر کی زبان۔ اپنے میزبانوں سے معذرت چاہی اور کہا کہ ہمارے درمیان زمین کا رشتہ ہے کہ میرے آباؤ اجداد نے جو کھیتیاں چھوڑی تھیں آپ نے انہیں سینچا ہے۔

وہ شام اپنے سکھ میزبانوں کے درمیان بیٹھ کر تقریب کے دوران اور تقریب کے بعد ایک احساس جو شدت سے ہوا یہ تھا کہ یہاں اگر کبھی کبھار سرد مہری کا شائبہ ہوا ہو تو وہ عنصر اس شام سے قطعی طور پر ناپید تھا۔ یہ لوگ بڑے سادہ دل اور پریت والے تھے۔ مگر ان کے ادب میں' ان کی کہانی میں اضطراب ضرور تھا۔ کذب بھی۔ شکایت بھی۔ انہیں اپنے معاشرتی ڈھانچے میں امریکی عمل

allurdupdfnovels.blogspot.com

دخل قطعی پسند نہیں آ رہا تھا۔

بگا سنگھ اور ان کی بیوی کلدیپ کور۔ دونوں ادیب ہمارے ساتھ گھر تک آ گئے۔ رات گئے تک گپ لگاتے رہے۔ بگا سنگھ کو ایک افسوس تھا کہ "میری تمام کتابیں پنجابی میں ہیں۔ آپ پڑھ نہ سکیں گی ورنہ میں وہ آپ کو ضرور دیتا"

دہلی سے اب کوچ کا ارادہ تھا۔ چند روز رہ گئے تھے۔ میرے میزبانوں کے ہاں ان کے باس کی بیوی آئی ہوئی تھی۔ گھر میں بہت چہل پہل تھی۔ کھانے پک رہے تھے۔ کمرے صاف ہو رہے تھے۔ مدراس سے آنے والی یہ سانولی سلونی شریمتی جی' دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرتی ہوئی انہیں "نیرو سنگز فیض" کی کیسٹ پیش کی تو بہت خوش ہوئیں۔ مجھے امرتا کہہ رہی تھیں دیکھو تم ہندوستان پر کچھ کہنے سے پہلے مدراس ضرور جانا۔ مدراس کا اپنا حسن ہے۔ بہت الگ سا ماحول ہے۔ یہ بات میرے دل کو لگی تھی۔ لیکن اب کے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔

مدراسی فن تعمیر' قدیم مندر' لیکن!

جیسو کے گھر میں دو مدراسی عورتیں کام کرنے آتی تھیں۔ ایک روز کچھ کھانا بچ گیا۔ وہ کئی دن پرانا تھا۔ اس نے فرج میں مزید رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ برتن دھوتے دھوتے ملازمہ کی نظر کوڑے دان میں پڑے کھانے پر پڑی۔ اسنے اپنی سوتی ساری کے پلو سے ہاتھ خشک کئے اور کوڑے دان سے کھانا نکال لیا۔ منہ ہی منہ بڑبڑا رہی تھی۔ خوامخواہ میں اتنا سارا کھانا پھینک دیا۔ ایک مفلس کا مال غنیمت۔

امرتا پریتم کہہ رہی تھیں مدراس ضرور جانا۔ اچھا!!

میں روسی کلچرل سینٹر کے کیفے ٹیریا میں بیٹھی تھی۔ آج یہاں شام فیض منائی جا رہی تھی۔ فیض کی سالگرہ ——— کیفے میں چند لڑکے دوسری میز پر بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔ اب خدا جانے یہ فیض کا کلام سننے آئے تھے یا تلوچن کور کی گلوکاری۔ رفیع کا گایا ہوا فلمی گیت "تم روٹھا نہ کرو" بج رہا تھا۔ میں نے یہاں آنے سے قبل

فیروز شاہ روڈ پر لمبی سیر کی تھی۔ آسمان پر بادل سے گھرے تھے۔ یوں بھی کئی روز سے یہاں خاصی سردی ہو رہی تھی۔ ایک دم جاڑا اس لئے چائے کی پیالی سے اٹھنے والی خوشبودار بھاپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس شام کی گلوکارہ تلوچن کور بھی اپنے سازندوں کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ غزل گانے میں تلوچن کور کا خاصا شہرہ ہے۔ اس تقریب میں ہندوستان کے دانشور فیض پر مقالے پڑھنے والے تھے۔ آواز آئی سوائے ان کے اپنے وطن کے فیض کی شاعری کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ اس جملے کا فوری ردعمل۔ "غصہ اور ندامت" ——— غصہ اس لئے کہ وہ صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے وہ غلط تھا۔ شرمساری اس لئے کہ یہ درست تھا۔ تنگ نظر اور رجعت پسند حکمرانوں کے تنگ دلوں میں فیض کے کلام کی گہرائی اور وسعت سمانے سے قاصر تھی۔ مگر یہ نہ کہو کہ ان کی شاعری کو سراہا نہیں گیا۔

میں جو تلوچن کور کی "غزل سرائی" کو تھوڑا سا سن کر اٹھ آئی تھی تو یہ میرا قصور نہ تھا۔ بلکہ قصور وار میرے ہم وطن فن کار تھے۔ فریدہ خانم' اقبال بانو' مہدی حسن' غلام علی۔ نہ جی نہ آپ یہ ہم پر چھوڑ دیں۔ بہر حال آپ کی غزل نوازی کا شکریہ۔

دہلی چھوڑنے سے پہلے گڑھی خدا بخش جانا بہت ضروری تھا۔ گڑھی اسٹوڈیوز' شہر کی گہما گہمی سے دور آرٹسٹوں کے لئے ایک جگہ بنا دی گئی کہ وہ یکسوئی سے تخلیق کاری کر سکیں۔ مگر اس روز آرٹسٹ کہاں چلے گئے تھے۔ نہ جانے کہاں۔ ایک دو اپنی ایزل لگائے نظر آئے۔ لان میں۔ مگر جاتے ہی لالیتا کلا اسٹوڈیوز کے نریندر ڈکشٹ مل گئے۔ ڈکشٹ مصور بھی ہیں اور لالیتا کلا کے ڈائریکٹر بھی۔ ان کے ہمراہ گرافک ورکشاپ پہنچے تو ارپنا کور اپنے کام میں مصروف ملی۔ پنجابی کی مشہور افسانہ نگار اجیت کور کی بیٹی۔ اس روز دہلی پنجابی اکادمی میں ذکر ہو رہا تھا گذشتہ بار اجیت کور افسانہ پڑھنے آئیں تو وہاں بڑی بھیڑ لگ گئی تھی۔ اجیت کور کا کوئی افسانہ پڑھنے کو نہیں ملا۔ امرتا پریتم شکایت کر رہی تھیں کہ میری ساری کتابیں پاکستان میں چھپ جاتی ہیں۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوتی۔ "یا برٹ

allurdupdfnovels.blogspot.com

ایڈیشن" بری بات ہے۔ یہ ایک سنگین ادبی جرم ہے۔ چوری ہے۔ لیکن امرتا جی اگر یہ چور نہ ہوتے تو ہم بھلا کیسے آپ کو پڑھتے۔ آپ کی کتابیں یوں مل جاتی ہیں کہ ایسے لگتا تھا کہ' آپ اردو میں لکھتی ہیں۔ ہم دونوں ملکوں کے درمیان ایسا باضابطہ طریقہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اردو ادب ہندوستان کی زبانوں میں ترجمہ ہو اور ہندی پنجابی' تامل' گجراتی' مراٹھی اور باقی ساری زبانوں کا ادب ہمارے ہاں اردو میں ترجمہ ہو کر چھپنے لگے۔

اجیت کور کی ایک کتاب کچے رنگوں کا شہر۔ لندن۔ اردو میں چھپی ہے۔ یقیناً اجیت کور کو اس کا علم نہ ہوگا۔ اس کتاب میں اوتار اور امرتا کے ساتھ اجیت کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بھی روایات کی فرسودگی کو ملیا میٹ کرنے میں خاصی معرکہ آرائی کی ہے۔

اس وقت ارپنا کے علاوہ ایک اور لڑکی بھی موجود تھی۔ ارپنا اپنی ایزل کے سامنے کھڑی ایک پتلی کی قمیض میں نیلا رنگ بھر رہی تھی۔ ارپنا کے کردار پتلیاں اور ویکس کے مجسمے دکھائی دیتے ہیں۔ ارپنا بھی فیمنسٹ ہے۔ اپنی ماں کی طرح سروج پال گوگی کی طرح۔ "میرا دوست جادوگر" ارپنا کا ایک خاکہ۔ السٹریٹڈ جادوگر جو انسال نہیں ہے۔ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہمیشہ سے انگلیوں پر عورت کو نچانے کا گر جانتا ہے۔ بڑا کلاکار ہے۔ ارپنا کے استعاروں میں سیاسی شعور بھی شامل ہوا ہے۔ "دنیا کا کاروبار چلتا ہے۔" اس سیریز کی ایک تصویر ایک طرف لاشوں کے انبار لگے ہیں' احتجاج ہوتا ہے پیڑ تشدد کی آندھی میں اپنا استحکام کھو دیتے ہیں۔ مگر اس سے کوئی معاشرتی بہتری پیدا نہیں ہوتی۔

ڈکشٹ کے دفتر میں۔ فہمیدہ میں اور ڈکشٹ بحث ہو رہی تھی۔ روایت کی قدامت پسندی کیوں نہیں ٹوٹتی۔ فوک آرٹ کے رسم و روایات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ پوجا کا وہی انداز ہے۔" "نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ تبدیلی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ارتقائی عمل جاری رہتا ہے۔ فوک آرٹ' دیہی ماحول سے شہروں میں منتقل ہوتا ہے تو اس میں از خود تغیر پیدا ہوتا ہے۔ بہت ساری غیر ضروری تفصیلات چھٹ جاتی ہیں"

ڈکشٹ عرصہ تک افریقہ میں رہنے کے بعد وطن لوٹے تھے۔ غربت تو انہوں نے اپنے ہاں بھی دیکھی ہو گی۔ مگر افریقی عوام کی حالت' ان کی زندگیوں میں گھلا ہوا درد اور بے چارگی نے انہیں بہت دکھی کیا تھا۔ وہ اپنی نئی تصاویر دکھا رہے تھے۔ سفید' سیاہ اور نیلے رنگ کا امتزاج۔ وہ لینڈ اسکیپس تھیں۔ مگر یہ انسانی منظر تھا۔ چہروں کے اضطراب' آنکھوں سے جھلکتی ہوئی وحشت' کرب' فن وقت کے ساتھ جڑا ہوا۔ اپنے آس پاس میں گھلا ہوا۔ شعور جاگا ہوا۔

ایک صبح ہندوستان ٹائمز پڑھ رہی تھی۔ ایک سرخی تھی "اب آپ سماچار میں ہندی سنئے" مجھے ایک دم ہنسی آ گئی۔ یہ سرخی انگریزی حروف میں اسی طرح لکھی ہوئی تھی۔ اتیا ملک کا کالم' سائٹ اینڈ ساؤنڈ' اتیا کو شکایت تھی کہ خبروں میں اس طرح باسٹرڈائزڈ' سنسکرت پیش کی جاتی کہ عام شخص کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ خاصی سخت زبان تھی باسٹرڈائزڈ سنسکرت کو ترجمہ کریں تو حرامی' زبان ہی بنتی ہے۔ اتیا کو کو غصہ تھا کہ ٹی وی پر مردہ زبان استعمال کی جاتی ہے۔ اسے عام فہم اور جدید بنانا چاہئے۔

ہم پر' اور ہمارے میڈیا پر یہ بڑا سخت وار تھا۔ اس لئے کسی کا ایسا کھلا لہجہ دل موہ لیتا تھا۔ اتیا کے اسی کالم کی ایک ہائی لائٹ تھی۔ "ہمارا ہر وزیر اعظم شروعات اس طرح کرتا ہے کہ مجھے میڈیا میں پراجیکٹ نہ کیا جائے لیکن پھر وہ خود کو صبح' دوپہر شام' کوٹ' کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔" کہا نا۔ ہم دونوں ملکوں میں رہنے والوں کی بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ چہروں اور بالوں کی رنگتیں۔ ایک ہی طرح کے سیاسی و سماجی موسم۔ ایک ہی طرح کے وزیر۔ اور میڈیا پالیسی ساز۔ بس تھوڑا بہت علاقائی فرق تو ایک ہی ملک کے مختلف صوبوں میں بھی آ جاتا ہے۔ یہ بھی تو دیکھو کہ ہمارے ہاں جمہوریت ابھی جھنگوڑے سے باہر نہیں نکل پاتی کہ اس پر کوئی نہ کوئی افتاد آ پڑتی ہے۔ ملکی اور غیر ملکی جبکہ ہندوستان کی جمہوریت کی داڑھی مونچھ میں سفید بال جھلکنے لگے ہیں۔

---

allurdupdfnovels.blogspot.com

عموماً یہ ہوتا ہے کہ بیرون ملک سے کوئی دوست کوئی عزیز' رشتے دار' آ جائے تو سب سے ملاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ مصلحتیں آڑے آ جاتی ہیں۔ گھر میں کوئی آ گیا اور اسے بتایا کہ یہ میرے بچپن کی دوست ہے۔ پاکستان سے آئی ہے۔ جرنلسٹ ہے۔ تو کل کلاں انٹیلی جنس کی زد میں نہ آ جائیں۔ وہ کیوں آئی تھی۔ آپ کے ہاں کیوں ٹھہری تھی۔ وہ کس ایجنسی کے لئے کام کر رہی تھی۔

میرے میزبانوں کے ہاں کوئی بہت بڑی کاروباری اور دفتری قسم کی دعوت ہونے والی تھی۔ مجھ سے کسی نے کچھ نہ کہا۔ مگر میرا اپنا فیصلہ تھا کہ مجھے یہ شام کسی نہ کسی طرح باہر گذارنی ہے اور اس وقت لوٹنا ہے جب دعوت میں استعمال کئے گئے جھوٹے برتن رسوئی میں جمع کر دیئے جائیں اور بچا ہوا کھانا فرج میں رکھا جا چکا ہو۔

خدا بھلا کرے روی شنکر کا جو وہ اتنا اچھا ستار بجاتے ہیں کہ گھر سے غائب ہونے کی شعوری کوشش فطری خواہش بن جائے۔ پنڈت روی شنکر کی شہرت سنتے سنتے عمر بیت گئی تھی۔ انہیں صرف پندرہ روپے میں سن لیتا۔ ان کے سامنے بیٹھ کر! واہ کمال ہو گیا۔ ہمارے ہاں بھی بہت بڑے بڑے موسیقار اور گلوکار ہیں۔ لیکن پندرہ روپے کا ٹکٹ خرید کر کسی آڈیٹوریم کی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اپنے محبوب فنکار کا دیدار کر لینا بھی ممکن نہیں ایک بار ہماری ملکہ ترنم نورجہاں کا اسٹیج شو کراچی میں منعقد ہوا۔ ٹکٹ ایک ہزار روپے تھا۔ اس لئے ہال خالی خالی رہا۔ پنڈت روی شنکر کا شو جو شنکر لال ہال کے لان میں منعقد ہو رہا تھا وہاں ہزاروں لوگ آئے تھے۔ ٹکٹ 5 - 10 - 15 اور سب سے زیادہ 25 روپے کا تھا۔ میں نے دوران سفر کفایت برتی تھی۔ پندرہ روپے کا ٹکٹ لے کر تیسرے حلقے میں بیٹھی تھی۔

روی شنکر نے ستار چھیڑا تو جیسے من میں کلیاں چٹکنے لگیں۔ راگ بیہاگ پھوار برسنے لگی۔ پھر جب مسند پر بیٹھا' نیم وا آنکھوں سے تاروں کو چھیڑتا ہوا موسیقار ترنگ میں آیا تو جیسے فضا میں حسیناں رقص کرنے لیں۔ پھولوں کے رس سے سرشار حسیناں' اپنے آپ سے باہر آنے کی دھن میں بیکل۔ میرے قریب ایک بوڑھ قسم کا امریکی بیٹھا تھا۔ سیاح تھا۔ وہ روی شنکر کو سننے تو آ گیا تھا مگر متاثر ہوئے بغیر بیٹھا رہا۔ اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی ہندوستانی لڑکی سے کہہ رہا تھا

"او' لک دھوتی۔!! میں نے پاکستان میں بھی بہت دھوتیز دیکھی تھیں"

ارے ہاں —— تم اس سے اور آگے جاؤ گے تو بنگلہ دیش' برما' نیپال تمہیں وہاں بھی بہت ساری "دھوتیز" ملیں گی۔ یہ گرم ممالک میں رہنے والوں کا ایئرکنڈیشنڈ پہناوا ہے پھر اس میں اور بہت ساری آسانیاں ہیں۔ نہیں یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تم اسے "کاسٹیوم پریڈ" سمجھ کر خوش ہوتے رہو۔

میری دوست کو اس روز گڑگاؤں جانا تھا۔ یہ دہلی کا مضافاتی علاقہ ہے۔ اس نے راستے میں قطب مینار دکھانے کی مہربانی کی۔ دہلی کی اسٹیل ٹاور قطب مینار کی مرمت ہو رہی تھی۔ قطب مینار اسٹیل ٹاور سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس لئے کہ وہ محض لوہے کا ڈھانچہ نہیں ہے۔ قبل دوپہر کا سمے تھا۔ اس لئے احاطے میں موجود روشنی اور سائے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی آرزو میں گیروی دیواروں' محرابوں اور محراب کی کنگریوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ کیمرے کے ہر فریم میں کئی دلنشین رنگ و نقش سمٹ آئے تھے۔ لوہے کا ایک ستون' سیاہی مائل بھورا ایک دم گول اور سیدھا۔ 1500 سال پرانا وشنو' چندر گپت کی یاد میں تعمیر کیا گیا۔ یہاں پر امام ضامن کا مقبرہ تعمیر کرتے ہوئے' یا فتح کی علامت قطب مینار بناتے ہوئے لوہے کے اس سیاہ ستون کو گرایا نہیں گیا۔ بلکہ اسے محفوظ کر لیا گیا۔ اس ستون کی خصوصیت یہ ہے کہ کئی سو سال گذر جانے کے باوجود اس میں زنگ نہیں آیا۔ قدیم زمانے کی خالص روایت۔ جیسو نے کہا۔ اس ستون سے لپٹ کر' اگر دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے جا ملیں تو جو دعا مانگو پوری ہو جاتی ہے۔ یہ بات اس نے کسی سے سنی تھی میں نے کوشش کی۔

بازو اتنے لمبے کہاں۔

جن کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں انہیں اپنی مرادیں پوری کرنے کے لئے دعا

allurdupdfnovels.blogspot.com

مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

دہلی میں میری' آخری شام تھی۔ انوپا لوگ نے میرے خلاف اچھی خاصی سازش تیار کر رکھی تھی۔ یہی کہ وہ سب مجھے دہلی کے تمام فائیو اسٹارز ہوٹلز گھمانے لے چلیں گے۔ دہلی بڑا شہر ہے۔ تاریخی' بڑا نامور' راجدھانی۔ پھر بھی اتنے سارے فائیو اسٹارز۔ دہلی والوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ جب یہاں ایشین گیمز منعقد ہونے کا پروگرام بنا تو سوچا کہ اتنے سارے لوگ بھلا کیسے اور کہاں رہیں گے اس وقت موجود سب بڑے ہوٹل ناکافی تھے۔ بس اسی بات پر دھڑا دھڑ ہوٹل بن گئے نئے دور کے تاج محل۔ بڑے خوبصورت' روایت اور جدت کا امتزاج۔ ایسے ہی کہ تن نیا نیا اور جدید مگر من اپنا وہی ہندوستانی۔

سرلا ایک خوبصورت لڑکی جس سے ایک شام ملاقات ہوئی۔ ذرائع ابلاغ کی سہولت اور وسعت میں پنپنے والی نئی نسل کی رکن۔ اس کا جی چاہے کہ اس کا دوست کرن اسے کسی بڑے ہوٹل کی کافی شاپ میں ملا کرے۔ وہ اسے مہینے میں کم از کم ایسے دو کارڈ بھیجا کرے جن پر محبت بھری تحریریں چھپی ہوتی ہیں۔ مگر کرن ایک غریب اخبار نویس تھا۔ کلکتہ کے رئیس کا انقلابی بیٹا وہ پتا کی دولت اور مزید دولت پیدا کرنے کی تگ و دو کو چھوڑ کر ایک کمیونسٹ اخبار میں ملازم ہو گیا تھا وہ سرلا سے کہتے "مجھے تمہارا فائیو اسٹار کلچر پسند نہیں ہے" تھوڑی دیر کو سرلا مان جاتی۔ لیکن جی ہی جی میں جھنجلاتی۔ اس سے خفا ہوتی۔ کرن معافیاں مانگتا —— کہتا ورگا ماتا مجھے معاف کر دو۔ آئندہ دیر سے نہیں آؤں گا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ سرلا نے ماں باپ کی پسند سے ایک بڑے افسر سے شادی کر لی اور کرن فائیو سٹار کلچر سے آزاد ہو کر اپنے انقلابی اخبار کی کاپیوں میں مشغول ہو گیا۔

پنک سٹی ایکسپریس پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی تھی۔ پنک شہر جے پور کے لئے روانگی۔ ریل کے ڈبوں کے اندر باہر کا گلابی پینٹ اجلا اجلا تھا۔ بچوں کے فراکوں کا رنگ' نرسری کا رنگ' معصومیت کا رنگ۔ صبح کے پونے چھ بجے تھے۔ اس روز پرانی دلی میں کرفیو لگا تھا۔ اس لئے تمام شام یہی فکر لگی رہی کہ خدا جانے ریل گاڑی روانہ بھی ہوگی یا نہیں۔ میں نے اپنے میزبانوں سے گذارش کی تھی کہ وہ مجھے رات کو ہی اسٹیشن پر چھوڑ دیں۔ صبح چار پانچ بجے چھوڑنے کے لئے جانا بہت زیادتی ہے۔ مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ میری واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تو میرے سامنے ایک طویل سفر تھا۔ بہت سے پڑاؤ بھی۔

کمپارٹمنٹ میں خاصی خاموشی تھی۔ بہت سے مسافر کمبلوں کی بکل مارے اونگھ رہے تھے۔ میرا حال بھی ان سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ آنکھیں موندے آہستہ آہستہ دور ہٹنے والی دلی کو یاد کر رہی تھی۔

"خدا جانے اسے ٹکٹ ملا کہ نہیں۔"

کون' کسے !! —— وہ شخص جو بکنگ کلرک پر برس رہا تھا۔ میرے علاوہ ایک اور عورت مردانہ قطار سے الگ ہو کر ٹکٹ لینے لگی تو قطار میں کھڑے ایک شخص کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگا یہ کیا بات ہوئی۔ مرد ہو یا عورت سب کو ایک قطار میں لگنا چاہئے۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ بڑا ترقی پسند لگ رہا تھا۔ اب خدا جانے وہ ایسا تھا بھی کہ نہیں یا یہ کہ وہ اس ذہنیت کا مالک تھا کہ گینٹز فرسٹ نہیں لیڈیز لاسٹ۔ میرا خیال ہے وہ یہی کچھ تھا۔ قطار ہی میں سے ایک اور آدمی بولا۔ "ارے تمہاری اپنی عورت ہوتی تو ....."

تو پھر وہ یہی کہتا۔ "چل تو اس کھڑکی سے ٹکٹ لے آ میں پیسے کے پاس کھڑا

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہوتا ہوں۔"

دھرتی اونگھتی ہوئی۔ آنکھیں ملتی ہوئی۔ جمائی لیتی ہوئی سرد رات کی لپیٹ سے نکل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ جاگ رہی تھی۔

آواز آئی۔ "کافی' چاکلیٹ" ——— ارے کافی اور چاکلیٹ ایک دم یورپی مزاج۔ ہمارے پاس تو اتنی کافی یا چاکلیٹ ہے ہی نہیں جو ریل کے ڈبوں میں فروخت کر سکیں۔ ہندوستان کے پاس یہ دونوں چیزیں اپنی اگائی ہوئی اور اپنی بنائی ہوئی ہیں ہم کافی اور چاکلیٹ دونوں باہر سے منگواتے ہیں۔ ہمارے ریل کے ڈبوں میں چائے' بسکٹ' ٹافیاں اور سونف سپاری بکتی ہے۔

الور کے بعد گاڑی راجستھان کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ سورج طلوع ہوا تو ہریالے کھیتوں نے سماں باندھا۔ تا حد نظر۔ سرسوں کھلی ہوئی گندم کی بالیاں جھولتی ہوئی۔ زمین کا رنگ گیروا تھا۔ بہت خوبصورت۔ ایک مور منڈیر کے کنارے پر کھولے کھڑا تھا۔ چلتی ہوئی ریل گاڑی سے باہر' جگہ جگہ' کالے' سفید' چتکبرے مور' دانہ چگتے' کھیتوں کے اوپر پرواز کرتے دکھائی دیئے۔ میرے لئے یہ ایک دل موہ لینے والا منظر تھا۔ میں نے پہلی بار اتنے آزاد مور دیکھے تھے۔ ورنہ اس حسین پرندے کو میں نے ہمیشہ قید میں ہی دیکھا ہے۔ کبھی کسی چڑیا گھر کے پنجرے میں اور کبھی کسی شوقین مزاج کے باغ میں۔ مگر یہاں' راجستھان کے اس دیہی علاقے میں مور ایسے مزے سے ادھر ادھر اڑ رہے تھے جیسے ہمارے ہاں چڑیاں کوے اور چیلیں۔ اس کی اڑان میں اس قدر بچلا پن تھا کہ آزاد ہیں اور آزادی چھن جانے کا خوف بھی نہیں۔

دور' پس منظر میں پہاڑی سلسلہ دکھائی دینے لگا تھا۔ زمین کا رنگ سرخی مائل سے زرد ہو گیا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں کانٹے دار دکھائی دے رہی تھیں۔ کم بارش والے علاقوں کی قدرتی نباتات۔ فطرت کے رنگ ہلکے پڑے۔ وہ نیلے ہوئے تو وہاں ملبوسات کے رنگوں میں شوخی آ گئی۔ ریلوے اسٹیشنوں اور کھیتوں میں کام کرنے والی عورتوں کے دوپٹوں اور گھاگھروں کے رنگ' مردوں کی پگڑیوں لنگیوں کے رنگ گہرے سبز' سرخ' نارنجی' زرد ——— پاؤں میں جوتا نہیں' نہ سہی پازیب سنائی دینی چاہئے۔ گندھے ہوئے بالوں میں رنگ دار پراندہ بالیاں اور جھومر۔ ایسا سنگھار کہ ماحول کا پھیکا پن اس کے سامنے شرمندہ ہونے لگے۔ تبھی تو یہ لوگ راگ اور راگنیوں کی تصویریں بناتے ہیں۔ گاڑی بندی کوٹا جنکشن پر کھڑی تھی۔ اب یہ نارتھ ریلوے نہیں رہی تھی بلکہ ویسٹرن ریلوے ہو گئی تھی۔

سبط بھائی نے کہا تھا کہ جے پور جانا ہو تو ڈاکٹر فضل امام جو جے پور یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ کے صدر ہیں ان سے رابطہ قائم کر لینا۔ میں نے انہیں دہلی سے جو خط لکھا تو اس کے جواب میں ڈاکٹر فضل امام کی طرف سے خوش آمدید' مل چکی تھی۔ اس لئے میں جے پور ریلوے اسٹیشن بہت سے اعتماد کے ساتھ اتری تھی۔ مگر نہ وہ مجھے جانیں اور نہ میں انہیں۔ کیسے پہچانیں گے۔ یہ بھی نہ کہا کہ سبط بھائی کی تصویر لے کر ہی چل پڑتی۔ کہ کوئی متوجہ ہوتا تو کہتی۔ نہیں ——— آپ انہیں پہچانتے ہیں۔ ہاں سبط حسن ——— جی وہی ہمارے مارکسٹ دانشور

"جی میں ----"

مگر۔ میں نے رکشا والے سے کہا۔ "جے پور یونیورسٹی کیمپس"

ایک فلیٹ کے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کیا یہ ڈاکٹر فضل امام کا گھر ہے؟"

"جی ہاں۔"

جی میرا نام ----

آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے

"شکر ہے" جی ہاں۔ ٹرین دو گھنٹے لیٹ تھی۔ ایک گلاس پانی۔

"اچھا۔ ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔"

بچے اسکول سے آئے تھے۔ ماں نے کہا آنٹی کو سلام کرو۔ بچوں نے نمشکار کے انداز میں ہاتھ جوڑے اور کہا "اسلام علیکم" باہر کا ماحول اور گھر کا ماحول' دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے تھے۔

ڈاکٹر فضل امام آئے تو کہا کہ آپ کی گاڑی لیٹ ہو گئی۔ میرے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ڈیپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹس آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ کل اتوار ہے۔ یونیورسٹی بند ہے۔ آپ کا کیا پروگرام ہے۔

"جی مجھے سوموار کو بہرحال روانہ ہو جانا ہے۔" لیکن کتنا جی چاہ رہا تھا ہندوستان میں اردو پڑھنے والوں سے مل لیا جاتا۔ مگر وہ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

ڈاکٹر افضل امام۔ اہلیہ آٹھ بچے اور دو کمرے 8 - 12 فٹ اور 10 - 12 فٹ کے چھوٹا کمرہ' چارپائی' دو بید کی کرسیاں ایک تپائی کتابوں کی الماری بیڈ روم' اسٹیڈی' مہمانوں کی بیٹھک سبھی کچھ ڈاکٹر صاحب کے قبضے میں دوسرے کمرے میں سارے بچے' بیگم' ایک رشتے دار لڑکی —— سبھی' چٹائیاں بچھا کر سو رہے۔

"میں نے آپ کے قیام کا انتظام یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں کروا دیا ہے۔ قریب ہی ہے۔ کھانے کے بعد میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب سے میں نے راستے میں پوچھا۔

"آپ اردو ڈیپارٹمنٹ کے صدر ہیں نا۔"

"جی۔"

مگر کیا اس عہدے دار کے لئے جے پور یونیورسٹی میں اس سے بہتر رہائش گاہ نہیں؟

ڈاکٹر فضل امام نے گول مول جواب دیا۔ نہ جانے ان کی کیا مجبوری تھی۔

ٹورسٹ بس کو 9 بجے روانہ ہونا تھا۔ ایک دن میں جے پور کو کور کرنے کا اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں ریسٹوران کی ایک میز پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ آج صبح سویرے میں گیسٹ ہاؤس سے نکلی تو ایک مور جو سڑک کے عین بیچ میں کھڑا چونچ سے سڑک کی سطح سے کچھ اٹھا رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہی جھپک سے اڑ گیا۔ بیابانوں میں تو مزے سے اڑتے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ مور آبادی میں بھی بڑا نڈر اور بے خطر لگ رہا تھا۔ اس نے میری صبح کو بڑا خوبصورت بنا دیا تھا۔

"ایک سمارٹ سا لڑکا' چار خانے دار قمیض اور گرے پتلون پہنے' سیاحوں

سے مخاطب ہوا۔ اپنا تعارف کروایا۔ کہنے لگا۔ میں کسی طور بھی اجنبیہ بچن سے کم نہیں دکھتا۔ لیکن بس قسمت ہے کہ میں ابھی تک صرف ٹورسٹ گائیڈ ہی بن سکا ہوں"

اس کی اس بات سے نہ جانے کہاں کہاں سے آئے ہوئے سیاح مردوں اور عورتوں کے مابین اجنبیت جو کچھ دیر پہلے تک تھی تار تار ہو گئی۔ میرے ساتھ ایک سلونا سا' دبلا پتلا لڑکا بیٹھا تھا۔ نیپال سے آیا تھا۔ اپنے چچا سے ملنے۔

پھر۔ جہاں کہیں رکتے سب محل مل سے جاتے۔ "نواب صاحب کی حویلی" —— ٹوڈر کی پہلی منزل۔ مگر کیا۔ یہ نواب صاحب کی حویلی ہے یا کوٹھا۔ ہم نیم تاریک' تنگ سی سڑھیوں پر سے اوپر چھت پر آئے۔ وہاں کچھ آئینے لگے تھے۔ بھلا یہاں کیا کریں۔ آئینوں میں سے بازار کی جھلک دیکھیں۔ اور وہ جو پہاڑوں کے پیش منظر میں ایک عمارت نظر آ رہی ہے اس پر جھنڈا لہرا رہا ہے۔ وہ راجہ کا محل ہے۔

کسی نے کہا۔ "سنیں۔ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا"

"بیوقوف بنانے کے لئے"۔ سب ہنسنے لگے

گڑیوں کا عجائب گھر' —— مرکزی عجائب گھر۔ ملبوسات' زیورات' دیگی مناظر۔ ایک کمزور مرد زمین پر لیٹا ہے۔ دوسرا مرد جو زور آور اور ہٹا کٹا ہے جوتوں سمیت اس کے سینے پر چڑھا ہوا۔ تو یہ یہاں بھی ہوتا ہے۔ ہر جگہ ایسا ہوتا ہے۔ فیوڈل معاشرے میں۔ باری کے سینے پر وڈیرہ۔ صنعتی معاشرے میں مزدور کے سینے پر سرمایہ دار اور صنعت کار۔

"ہوا محل" —— جے پور کا لینڈ مارک۔ اسے ہوا محل کیوں کہتے ہیں۔ ایسے جیسے اس محل میں رہنے والے ہوا میں اڑتے دکھائی دیتے ہوں۔ ایک امریکی سیاح کو اس محل کا آرکیٹیکچر ویڈنگ کیک جیسا لگا تھا۔ گلابی رنگ کا محل۔ اسے ہوا محل اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے جھروکوں' سوراخوں میں سے ہوا فر فر کرتی ادھر جاتی ہے پھر فر فر کرتی دوسری طرف نکل جاتی ہے اسے اس لئے بنایا گیا تھا کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

مہارانیاں اور راجکماریاں اس میں سے تاک جھانک کر سکیں۔

اس محل کا کمال یہ ہے کہ اس کے زیر زمین بنیاد نہیں ہے۔ یہ بس ہوا میں کھڑا ہے'

گائیڈ قصہ کہہ رہا تھا۔ مگر کوئی بھی اس کی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ نہ ہی کسی کتاب میں اس کی تصدیق ہو سکی ہے۔

میرے اور اس نیپالی لڑکے کے سوا بس میں سوار ہندوستانی تھے۔ یہ لوگ اپنے ملک کو بڑے شوق سے اور بار بار دیکھتے ہیں۔ وہ سب اتنے خوش مزاج تھے کہ چوسر یاد آنے لگا۔ کنٹیبری جانے والا یاتریوں کا ٹولہ۔ گپ باز۔ اوہو۔ کیا ہوا۔ چپل ٹوٹ گئی۔ یہ عورتوں کی کھوپڑی۔ ارے بابا سیر کے لئے نکلتے وقت ٹوٹ جانے والی چپل کو گھر پر چھوڑنے میں کیا ہرج تھا۔ اب کیا کریں۔ بس رکی تھی۔ دونوں پتی پتنی جوتوں کی دوکان کی طرف بھاگ رہے تھے۔ پتی حوصلے والا تھا۔ بیوی کو ذرا بھی کچھ نہ کہا۔ پتنی —— شرمندہ شرمندہ سی۔ آئندہ دھیان کروں گی۔ کیا پتہ تھا یہ کم بخت!! مل گئی۔ چلو اچھا ہوا۔ "ویری گڈ" عنبر پیلس' گائیڈ نے بس ڈرائیور کو اشارہ دیا۔ یہ محل اکبر کے معتمد اعلیٰ مان سنگھ نے بنوایا تھا۔

جے پور کی تاریخی اہمیت اور راجستانی داستانیں اسے ممتاز بناتی ہیں۔ مگر جے پور کی تعریف و توصیف یہ سنی کہ اس شہر میں ہر شے گلابی ہے۔ ہر شے گلابی!! مکان دکانیں' دفتر' لباس' گاڑیاں' سائیکل' رکشہ۔ بجلی کے کھمبے' تو کیا یہ سب کچھ گلابی ہو گا۔ پھر تو وہ ایک دم پریوں کا دیس لگتا ہو گا۔ مگر وہ --- کہیں نہیں تھا۔ میں نے اسے اندرا بازار اور باپو بازار میں بھی ڈھونڈا۔ ٹورسٹ انفارمیشن کے دفتر سے پوچھا۔ شہر سے زیادہ تو پنک سٹی ایکسپریس گلابی تھی۔ یہ نام نہاد گلابی رنگ' شہر کی پرانی فصیل پر جو مکانوں کی میلی میلی چھتوں کی اوٹ سے جھانکتا' ہوا محل پر یا ایک آدھ اور جگہ دکھائی دیتا ہے ورنہ پنک سٹی' کا حال وہی ہے کہ والدین اپنے لاڈلے بیٹے کا نام نیک دل خان رکھ دیں اور وہ بری صحبت میں پڑھ جائے جیب کترا بن جائے۔ چوری چکاری کرنے لگے۔ مگر سب اسے نیک دل ہی کہہ کر

پکاریں گے۔

جھیل کے کنارے بس رکی۔ یہاں سے عنبر پیلس تک یا تو ہاتھیوں پر جاؤ یا پھر پیدل مارچ کرو۔ بچے سجائے' ٹیکسی بنے ہاتھی زندہ سلامت' پلے پلائے۔ بادشاہوں کے زمانے کی جیتی جاگتی نشانی۔

انسان کی اچھی بات یہ ہے کہ وہ دستیاب وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ ٹھکانہ ایسا ہو' چاہے محل کی صورت میں ہو یا کٹیا کی شکل میں' مگر وہ سردی میں گرم اور گرمی میں ٹھنڈا رہے جس زمانے میں بجلی نہیں تھی۔ ایئر کنڈیشنر نہیں ہوتے تھے۔ آرکیٹکٹ نے کمروں میں چھوٹی چھوٹی نالیاں بنا دیں کہ ان میں سے گذرتا ہوا پانی اندروں کو ٹھنڈا کر دے۔ یا پھر جھیل کے عین بیچ میں جل محل' بنا دیا۔ گرمیاں گذارنے کے لئے جل محل کو دور سے دیکھو تو ایسے لگتا ہے کہ کوئی بڑی کشتی دلدل میں پھنس گئی ہو۔

گائیڈ نے ابھی کچھ دیر پہلے شیش محل میں دروازے بند کر کے ایک ماچس جلا کر اس کی ایک لو سے لاکھوں لویں بنائی تھیں۔ فن تعمیر کا حسین نمونہ کہ برتی قمقموں کے دور میں رہنے والے لوگ شیش محل کے اندر ماچس کی لو کو ٹمٹماتے دیکھ کر مجسم "واہ واہ" ہو کر رہ گئے تھے۔

میلا دیوی کا مندر۔ جوتے اتار دیئے گئے اور جن مردوں نے چمڑے کی پٹیاں باندھ رکھی تھیں وہ بھی۔ میرا بیگ اور کیمرہ بھی۔ اس مندر میں چمڑے کی کوئی شے لے جانا منع ہے مندر کے اندر رکھی ہوئی کالی ماتا کی مورتی راجہ مان سنگھ سولہویں صدی میں بنگال سے لے کر آئے تھے۔

گائیڈ کی پڑ پڑ۔ "راجہ صاحب کبھی بحری سفر نہیں کرتے تھے کہ جہاز کے نیچے بہت سارے جاندار ہوتے ہیں۔ وہ ہر سفر پر جانے سے پہلے ایک بکرے کی قربانی دیتے تھے۔"

میرے قریب ایک نیا نویلا جوڑا کھڑا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ لاہور سے آئے ہوں۔ میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

"کیا آپ پنجابی ہیں" —— لڑکی چپ رہی۔ لڑکا برا مان گیا۔ لمحہ بھر کو کچھ

allurdupdfnovels.blogspot.com

سمجھ نہ آیا۔ اوہ۔ خیال ہی نہیں رہا۔ یہ ہندوستان ہے۔ جہاں پنجابی سے مراد لاہوری' فیصل آبادی نہیں بلکہ امرتسری' چندی گڑھ اور ہریانوی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو کوسا۔ حساس معاملے کو چھونے یا چھیڑنے سے گریز کرنا ہی بہتر ہے' مگر وہ لڑکا کچھ ایسے بات کر رہا تھا کہ جیسے لڑکی کو بھگا کر لایا ہو اور سب سے چھپتا پھرتا ہو۔ اس لئے کہ جب ہماری پارٹی عنبر پیلس سے شہر کی طرف آ رہی تھی وہ دونوں راستے میں بس کو رکوا کر اترے اور خالی خالی گلیوں میں غائب ہو گئے۔

راجپوت مرد اپنی دلیری کا لوہا منانے کے لئے لڑتا رہا۔ وہ جنگجو بنا۔ ہٹ دھرم تھا۔ انا پسند ہی نہیں بلکہ انا پرست بھی تھا۔ جان دینا منظور مگر بے عزتی برداشت نہیں ہو سکتی۔ جاپانیوں کی طرح خودکشی کمزوری نہیں بلکہ بہادری کی علامت ہے۔ اس طرح "اجتماعی جوہار" کی رسم نے جنم دیا۔ مغل بادشاہوں سے دوستی ضرور ہوئی۔ جے پور' شہنشاہ اکبر کی سسرال بنا۔ مگر کوئی مغل یہاں فاتح بن کر نہیں آیا یہی وجہ ہے کہ راجستھانی جو کبھی راجپوتانہ تھا اس کی رسم و روایات' اس کی فطری مزاج و کردار برقرار رہے۔

ہمارے دن بھر کی اگلی منزل جنتر منتر اور سٹی میوزیم تھا۔ راجہ جے سنگھ کو عنبر محل الگ تھلگ لگتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنا شہر بسانے کا منصوبہ بنایا۔ کشادہ متوازی شاہراہیں باغات' محل' جے پور کا جنتر منتر' دہلی کے جنتر منتر سے پہلے بنا تھا۔ سٹی پیلس کے سامنے روایتی وردی میں ملبوس چوبدار ڈیوٹی دے رہا تھا۔ مگر اب اس محل میں کوئی نہیں رہتا وہاں محض گذرے وقتوں کے نشان باقی ہیں۔ البتہ محل میں جواب لاجائب گھر ہے' راجستھان منی ایچرز کا معقول ذخیرہ محفوظ کر لیا گیا ہے۔

جنگجو راجپوت اپنی مہم جوئی کے شوق میں طویل عرصہ کے لئے گھر سے باہر رہتا تھا۔ راجپوتنی نے گھر کے اندر شوہر کے انتظار میں اپنے دل بہلاوے کے کئی حیلے نکالے۔ وہ شعر کہتی۔ تصویریں بناتی بھجن گاتی' داسی بنی رقص کرتی۔ مرد معاشقے لڑاتا' جوا کھیلتا' شراب پیتا۔ عورت بھگت بنی' اپنے اظہار کے وسیلے تلاش

کرتی تھی۔ فوک آرٹ نے جنم لیا۔ جس نے راجستھان کے مکتب مصوری پر گہرا اثر چھوڑا

بمبئی کی فیشن ایبل بوتیکس اور دوکانوں میں سلک اور سوتی کپڑے پر بنی رادھا اور کرشن' رام اور سیتا کی بہت سی تصاویر نظر آئیں تو پوچھا۔ "یہ کون بناتا ہے۔" "یہ ہمارے پاس نارتھ سے آتی ہیں۔ وہاں کی عورتوں کا یہ پرانا کسب ہے۔" فوک آرٹ۔ ذریعہ معاش بھی۔ اپنے اندر کا اظہار بھی۔

سٹی میوزیم کے دیوان عام' کے برآمدوں میں بڑی بڑی چمکتی ہوئی' منجھی منجھائی دیگیں سجی تھیں۔ راجاؤں مہاراجوں کی فراخدلی کی نشانیاں مان سنگھ کے عنبر محل کا شیش محل' محرابیں' ستون' یہ مغل فن تعمیر کے اثرات تھے۔ اسی طرح راجہ جے سنگھ کے اس محل کا دیوان عام اور دہلی کے لال قلعے کا دیوان عام دونوں میں گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ البتہ ہوا محل کا اپنی مخصوص شناخت ہے۔ وہاں سب کچھ راجستھانی ہے۔ باہر سے نہیں آیا ہے۔

اسی طرح مغل منی ایچرز اور راجستھانی منی ایچرز ایک دوسرے سے بظاہر مطابقت رکھنے کے باوجود اپنی بنیادی اساس میں مختلف ہیں۔ مغلوں کی درباری مصوری' جہاں بادشاہوں اور شہزادوں کی پورٹریٹس محلاتی سیٹ اپ میں بنائی جاتی تھیں۔ ان میں حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کا عنصر غالب نظر آتا ہے جبکہ راجستھانی تصاویر میں رنگ تغزل ہے۔ وہ علامتی ہیں۔ وہاں رنگ تزئینی خاصیت کے اعتبار سے استعمال ہونے کے بجائے جذبات کی علامت بنتے ہیں۔ مثلاً سرخ رنگ ناآسودہ تمناؤں کی شدت کی علامت ہے مغل فن مصوری میں چہروں پر حکمت اور شکوہ نظر آتا ہے جبکہ راجستھان کی مصوری میں مرد اور عورت ایک ساتھ ایک دوسرے کی محبت سے سرشار ملتے ہیں۔ یہاں نرمی ہے۔ خطوط متحرک' خم دار' لہردار اور مترنم ہیں —— فطری نباتات کے جلو میں۔ پرندے' جنگلی جانور' ہرن' گائیں' گھوڑے' مور' پیڑ' پودے' پھول بیلیں' راجستھان کے کھردرے صحرا میں پنپنے والا فن ان سب کے ساتھ ہے۔ ان سب کو' سارے رنگوں کو' دھرتی کی ساری جولانیوں کو' اس کی نوازشوں کو راگ اور راگنیوں میں

allurdupdfnovels.blogspot.com

ڈھالتا ہے۔

سٹی میوزیم کے بیرونی دروازے کے سامنے برگد کے پیڑ کے تنے سے بہت سی گڑیاں لٹک رہی تھیں ایک عورت، گھاگھرے پر چنری کا دوپٹہ لئے اور ماتھے پر پیتل کا ٹیکہ سجائے —— گاؤں کی عورت —— گڑیاں بنانے والی۔ دن بھر میں جتنی گڑیاں بک جائیں وہ ان پیسوں سے سودا سلف لے کر شام کو اپنے گاؤں لوٹ جاتی ہے۔

اجمیر میرے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ نہ ہی اودے پور۔ دہلی میں سفر کا منصوبہ بناتے وقت جسمین کے اصرار پر میں جے پور سے اورنگ آباد جاتے ہوئے اودے پور میں مختصر پڑاؤ ڈالنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ہاں سے سرکاری وفد اجمیر شریف عرس میں شرکت اور زیارت کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ جن میں سیاست زدہ "اسلام پسند" اور حکمرانوں کے منظور نظر افراد شامل کئے جاتے تھے۔ اپنے "اینٹی اسٹیبلشمنٹ" ذہن نے اس کی نفی کی اور طے کیا تھا کہ یہ نہیں کرنا۔ مگر جے پور سے روانگی کے وقت دل میں اجمیر جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ ویسی ہی دلپذیر تھی جیسے کھجوراؤ کے بس اسٹینڈ میں جائے نماز بچھائے ڈرائیور کا فجر کی نماز ادا کرنا۔ اپنا اصل۔ اپنی تربیت۔ ثقافت۔ اپنائیت۔

مجھے دولت مند امریکیوں اور جاپانیوں کے انداز کی سیاحت پسند نہیں۔ مطلب یہ کہ اگر ان جیسی دولت بھی ہو تو بھی نہیں۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ وہ ہے بھی نہیں۔ امریکی اور جاپانی اپنے دھن دولت کو خرچنے کے لئے جہاز سے سفر کرتے ہیں۔ فائیو اسٹارز ہوٹلوں میں ٹھہرے، کنڈیکٹڈ ٹوور لیا اور اگلی فلائٹ سے آگے چل دیئے۔ نہیں جان رائز نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس نے "گرینڈ ٹرنک روڈ" لکھنے کے لئے بسوں میں ریل سے سفر کیا۔ وہ سراؤں ڈاک بنگلوں میں ٹھہرا۔ تانگوں میں گھوما۔ ایک دیسی علاقے میں سے گذرتے ہوئے ٹاہلی کے نیچے چارپائی ڈالے ایک شخص کو اونگھتے دیکھا تو جھٹ کیمرہ نکالا۔ تصویر کا کیپشن تھا۔ "گرینڈ ٹرنک روڈ

کے کنارے جہلم کے قریب آرام کرنے کا پاکستانی انداز۔"

جے پور ریلوے اسٹیشن پر جو تصویر بنتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک دبلا پتلا لڑکا جو رات بھر ویٹنگ روم کے باہر سردی میں ٹھنڈے فرش پر پڑا اونگھتا رہا تھا۔ اس نے رات آٹھ بجے کے قریب میرا سامان ویٹنگ روم میں رکھ کر کہا تھا کہ وہ صبح پانچ بجے مجھے اجمیر کے لئے گاڑی آنے سے قبل جگا دے گا اور سوار کروا دے گا۔

"میم صاحب، کچھ چاہئے ہو تو بتا دیں۔"

پھر وہ چائے لے آیا اور بار بار تاکید کرتا رہا کہ اس کے سوا مجھے کوئی دوسرا گاڑی پر سوار نہیں کروائے گا۔

میں پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں تھی۔ وہ سوٹ کیس کا ہینڈل تھامے۔ کھڑا تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک دم چہل پہل شروع ہو گئی۔ یہ انگریزوں کا گروپ تھا۔ مرد عورتیں نوعمر لڑکے لڑکیاں۔ کوئی ٹیکس، مفلر، پی کیپس، رک سیکس، وہ لوگ جودھ پور جا رہے تھے۔ جودھ پور جانے والی ٹرین پہلے آئی۔ کچھ دیر کے بعد اجمیر جانے والی ریل آ گئی۔ وہ لڑکا میرا سوٹ کیس اٹھانے ہی والا تھا کہ دور سے یکایک ایک ہٹا کٹا قلی وارد ہوا۔ اس نے لڑکے سے سوٹ کیس چھینا۔

"نہیں میم صاحب یہ آپ کا سامان گاڑی میں نہیں رکھ سکتا۔ اس کے پاس لائسنس نہیں ہے۔"

مگر یہ رات بھر----!

اگر لائسنس کی اس قدر سختی ہے تو پھر یہ پلیٹ فارم پر کیوں آیا۔ اسے کیوں آنے دیا گیا۔ مگر وہ زور آور قلی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ لڑکا مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔

یہ راجستھانی انداز کی قوت آزمائی تھی۔

ریل کا زنانہ ڈبہ تھا جس میں دونوں طرح کی عورتیں سفر کر رہی تھیں۔ ساڑھیاں پہنے۔ بندیاں لگائے اور کالے برقعوں میں لپٹی لپٹائی۔ گویا —— دل میں سوچا اس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی بھی ہے۔ سامنے کی سیٹ پر ایک وضع دار

allurdupdfnovels.blogspot.com

قسم کی ہندو شریمتی جی بیٹھی تھیں۔ سفید بال سفید چکن کی ساڑھی دھوبی سے دھلی ہوئی، کلف لگی سوتی ساڑھی۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ —— کالے برقعے والی لڑکی۔ عمر یہی 20 - 22 سال ہو گئی۔ اس نے قمیض اٹھائی اور بچے کو دودھ پلانے لگی۔ بچہ دودھ پی چکا تو اس نے اس کا لنگوٹ اتارا اور شی شی کا اشارہ کیا۔ بچے نے کمپارٹمنٹ کے عین بیچ میں پیشاب کی لمبی دھار مار دی۔

میں گھبرائی کہ ابھی یہاں ہندو مسلم فساد کھڑا ہو جائے گا۔ ارے اس ہندو خاتون کی اجلی ساڑھی اس قدر صاف اور بے داغ تھی تو بھلا اس کا مزاج کس قدر پوتر ہو گا۔ مگر انہوں نے کچھ نہ کہا۔ بڑی نرمی سے بولیں۔ "بچے کو ٹائلیٹ میں پیشاب کروا لیتیں تو یہ ڈبہ گندہ نہ ہوتا" برقعے والی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا خیال آیا۔ اس نے اپنی چادر کا کنارہ پھاڑ کر فرش سے پیشاب پونچھا اور چیتھڑے کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ وہ ہندو خاتون جو اپنے لہجے اور سبھاؤ سے کسی معزز گھرانے کی ماں، لگ رہی تھی اس وقت مجھے بالکل ایک دیوی لگی۔ بہت بڑی۔ اور میں اپنے آپ میں سکڑنے لگی تھی۔

خواجہ معین الدین چشتی کا قول ہے "جس شخص میں یہ تین اوصاف ہوں۔ خدا اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔ "دریا جیسا فراخدل —— سورج جیسا مخیر اور زمین جیسا منکسر المزاج"

گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر رکی۔ ایک اور بھاری بھرکم عورت کالا برقع پہنے پلاسٹک کی ٹوکری میں چند کپڑے وغیرہ ڈالے میرے سامنے کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا اگلا اسٹیشن اجمیر ہے" میں نے پوچھا۔

"کیا آپ پاکستان سے آئی ہیں"

"جی —— میں اودے پور جا رہی ہوں۔ کچھ دیر کو اجمیر میں رکنا چاہتی ہوں۔"

"آپ میرے ساتھ چلیں۔ میرا گھر درگاہ کے قریب ہی ہے۔ آپ میری

مہمان ہیں۔"

کیا کروں۔ پیشکش بری نہیں۔ مگر کسی انجان کے ساتھ یوں چل پڑنا اچھا نہیں۔ کوئی ہرج نہیں۔ سادہ سی عورت دکھائی دیتی ہے۔ پھر بھی؟ چلو اس کی بات مان لیتی ہوں۔

گاڑی اجمیر کی طرف بڑے اعتماد سے بڑھ رہی تھی۔ مگر میں شش و پنج میں تھی۔

اجمیر ریلوے اسٹیشن۔ پلیٹ فارم پر ایک نوعمر لڑکا ماں کو لینے آیا تھا۔ میں بھی اتر آئی ماں نے کہا آنٹی کا سامان بھی اپنے تانگے میں رکھ لو۔ ہمارے ساتھ چلیں گی۔ پاکستان سے آئی ہیں" لڑکا پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

تانگہ گلی کی نکڑ پر رک گیا۔ کیوں کہ وہ گلی اس قدر تنگ تھی کہ وہاں سے صرف پیدل ہی گذرا جا سکتا تھا۔ صبح کے آٹھ نو بجے تھے۔ گلی کی ایک بیٹھک کے تھڑے کے سامنے ایک شخص کڑاہی گرم کئے کچوریاں تل رہا تھا۔ صبح کا ناشتہ۔ ہم سیلی سیلی نیم تاریک گلیوں میں سے گذرتے ہوئے ایک پرانے سے مکان کے سامنے رکے۔ لڑکے نے کہا میں آپ کا سامان بیٹھک میں رکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کو درگاہ لے چلوں گا۔ آپ اوپر چلیں۔

مٹی کا چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ خاتون خانہ نے مجھے کہا کہ آپ چاہیں تو منہ ہاتھ دھو لیں۔ ٹن کے حمام میں پانی۔ لائف بوائے صابن کی ٹکیہ کا آخری ٹکڑا۔ گھر میں کوئی اور نہ تھا۔

"میرے شوہر کسی دوسری جگہ پر ریڈیو میں کام کرتے ہیں۔ ان کا کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں انہیں دیکھنے گئی تھی۔" وہ مجھے بتا چکی تھیں۔

کچھ دیر میں دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک شخص آیا تھا۔ وہ اسے بتا رہی تھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس پورے گھر میں کوئی سامان نہ تھا۔ فرش پر چولہے کے سامنے ایک؟

"اجمیر میں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی ہے۔ لیکن ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ سارا کاروبار ہندوؤں نے سنبھال لیا ہے" میری میزبان نے بتایا تھا

allurdupdfnovels.blogspot.com

مغل حکمران خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بڑے معتقد تھے۔ اکبر، جہانگیر اورنگ زیب سبھی یہاں زیارت کے لئے آئے۔ شاہجہاں نے مسجد تعمیر کروائی۔ بابا فرید شکر گنج نے یہاں چلہ کاٹا۔

"ملکہ وکٹوریہ بھی آئیں۔" میرے راہبر نے بتایا تھا۔ مگر ---- مجھے اس کی صداقت پر یقین نہ آیا۔

درگاہ پر جلی حروف میں خواجہ غریب نواز لکھا نظر آیا۔

روایت ہے کہ خواجہ معین الدین پندرہ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تو وراثت میں پھلوں کا ایک باغ اور پن چکی ملی۔ جسے انہوں نے فروخت کر کے تمام رقم غریبوں میں تقسیم کر دی اور خود درویشی اختیار کر لی۔ یہ ان کی پہلی غریب نوازی تھی۔

خواجہ غریب نواز کی درگاہ پر پکنے والی دیگوں کی بڑی شہرت سن رکھی تھی۔ وہ ٹھنڈی پڑی تھیں۔ دنیا کی سب سے بڑی دیگیں جن میں بیک وقت بیسوں من کھانا پک سکے۔ سنا کہ ان دیگوں میں اناج، دودھ، میوہ گوشت نہ جانے کیا کچھ ہوتا۔ جس کا جو جی چاہے ڈالتا جائے۔ پھر جب وہ حلیم پک کر تیار ہوتا تو اس کی لذت بڑی منفرد ہوتی۔ دیگوں کے اندر جھانکنے کے لئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی دیکھا خالی دیگوں کے پیندے میں نوٹ، بازو بند، چاندی کے کڑے۔ چوڑیاں، لاکٹ، سکے۔ اور نہ جانے کیا کچھ پڑا تھا۔ یہ غریب نواز کی فیض رسانی کی علامتیں تھیں۔ کسی نے اولاد کی منت مانی، کسی نے روزگار کی کسی نے بیٹی کے بر ملنے کا شکرانہ ادا کیا۔ تو ....

میرا میزبان کہہ رہا تھا وہ بی اے کر چکا ہے۔ ابھی تک نوکری نہیں ملی۔ چاہتا ہوں کسی طرح دبئی چلا جاؤں۔ مگر ویزا خریدنے کے لئے رقم نہیں ہے۔

میں نے اپنا سامان ایک مزدور کے سر پر رکھا تاکہ وہ مجھے بس اسٹیشن کے لئے تانگہ یا آٹو رکشا لے دے۔ اس نے تانگے میں سامان رکھا تو اجرت میں اسے دس روپے دیئے۔ اس پر قریب کھڑے تانگے والی کی نظر پڑی۔ اسے دوہائی دی۔ "ارے چندن آج تو تمہاری موج ہو گئی۔" بے چارہ چندن دس روپے کے نوٹ

کو قمیض کی اندرونی جیب میں چھپاتا ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی میں مڑ گیا۔

خواجہ غریب نواز کے شہر کے غریبوں کی آرزوئیں دبئی کے خواب۔ ایک چھوٹے سے موقع پر، قلیل اجرت پر قناعت۔

اودے پور کی بس آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ میں نے سیمنٹ کے بنچ کے قریب سامان رکھا اور بیٹھ گئی۔ دوپہر ہو رہی تھی۔ کھانے کی طلب ہوئی۔ مگر سامان کیسے چھوڑوں۔ اتنے میں آواز آئی۔ "ہیلو۔ آپ یہاں"

میں نے حیرت سے دیکھا۔ بھلا مجھے یہاں کون جانے گا۔ یہ وہی چپل والی بی بی تھی۔ ہم کل جے پور میں دن بھر ایک ساتھ رہے تھے۔ دونوں میاں بیوی پشکار جا رہے تھے۔ پشکار ---- خوبصورت مندروں کا ایک اور مقام۔ "میرا ارادہ بھی پشکار جانے کا تھا۔ مگر پھر اگلا پروگرام خراب ہو جائے گا"

اب وہ میرے پاس بیٹھی ہوئی بتا رہی تھی۔ دراصل وہاں میرا بھائی ہے۔ وہیں ایک مندر میں رہتا ہے۔ اس نے جے پور سے بھائی کے لئے ایک لحاف اور مورتی خریدی تھی۔ جے پور کی دونوں چیزیں بہت مشہور ہیں۔

میرا بھائی بڑا ہوا تو اس پر سایہ لگ گیا۔ وہ بہت بیمار تھا۔ ہم نے بہت علاج کروائے۔ وہ کچھ کھاتا پیتا نہیں تھا۔ اس قدر دبلا ہو گیا کہ چارپائی سے لگ گیا تھا۔ پھر ہم اسے ایک گورو کے پاس لے گئے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے اندر ایک الاؤ جل رہا ہے۔ وہ صرف اس وقت ٹھنڈا پڑے گا جب وہ دنیا تیاگ دے۔ ویسا ہی ہوا۔ میرا بھائی ہم سب کو چھوڑ کر بن باس ہو گیا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔

آپ کا یہ بھائی کیا بن گیا۔ رشی، جوگی یا ----؟

"وہ بیراگی بن گیا ہے"۔ بیراگی بن کر اس کی آتما کو شانتی مل گئی تھی۔

ان کی بس آ گئی اور وہ چلے گئے۔ اس اجنبی بھیڑ میں جو کچھ دیر کو تھوڑی سی شناسائی ملی تھی وہ پھر معدوم ہو گئی۔

میں ساتھ بیٹھے ہوئے ایک اور مسافر کو سامان کا خیال کرنے کا کہہ کر اٹھ کر کہیں گئی۔ لوٹی تو میرے بنچ پر ایک کھردرا سا، اکھڑ سا، نوکیلی مونچھوں والا

allurdupdfnovels.blogspot.com

جوانسال مرد براجمان تھا۔

"اوفو۔ میری جگہ ----"

ابھی میرا جملہ ادھورا تھا کہ وہ بپھرتا ہوا اٹھا اور کہا ——"کیا بات ہے؟"

جیسے وہ بلا وجہ جھگڑا مول لینا چاہتا تھا۔

اچھے برے لوگ ہر جگہ' ہر ملک' ہر شہر میں مگر عوامی جگہوں پر ملنے والے لوگ اپنے اپنے علاقوں کی گواہی دیتے ہیں۔ کبھی ان کی قدر قیمت بڑھا دیتے ہیں اور کبھی گھٹا دیتے ہیں۔ اس شخص نے اپنی' اجمیر کی' راجستھان کی عزت گھٹائی تھی۔

اجمیر سے اودے پور کوئی پونے تین سو کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ کوچ بعد دوپہر تقریباً 2 بجے اجمیر سے روانہ ہوئی تھی۔ اسے 8 بجے رات ہمیں اودے پور پہنچانا تھا۔ بڑی آرام دہ اور صاف ستھری کوچ۔ مسافر بھی ڈھنگ کے۔ کچھ غیر ملکی سیاح کچھ مقامی' میرے ساتھ جو لڑکا بیٹھا تھا وہ ایک دفتر میں سول انجینئر تھا۔ دفتری کام سے اودے پور جا رہا تھا۔ وہ پورا وقت ایک موٹی سی کتاب پڑھتا رہا۔

اب خدا جانے موٹر کمپنیوں کو ابھی تک یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ اتنی اچھی' آرام دہ' ایئر کنڈیشنڈ بسیں جو بنا لیتے ہیں وہ کسی کونے کھدرے میں ٹائلیٹ کیوں نہیں بناتے۔ بس سے سفر کی یہی ایک خرابی ہوتی ہے۔ ٹرین والے تو سب کچھ ریل کی پٹڑی کے بیچ میں پھینکتے جاتے ہیں جہاز والے ٹنکیاں بھر لیتے ہیں بس میں خیر ایسا کوئی سوراخ نہیں بنایا جا سکتا یہ بڑی بد تہذیبی ہوگی کہ سڑک کے عین بیچ میں الا بلا بکھری پڑی ہو۔ لیکن بھلا ٹنکی کیوں نہیں بن سکتی۔ اور یہ بات صرف امریکہ اور یورپ والوں کی سمجھ میں ہی آتی ہے کہ جو مسافر بس سے 6-8 گھنٹے کا سفر کرتے ہیں انہیں بھوک پیاس بھی لگتی ہے۔ انہیں ٹائلیٹ بھی جانا ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے شاہراہوں کے کنارے موٹلز یا سروسز کا انتظام کر رکھا ہے۔ اودے پور جانے والی کوچ ایک بار تو کسی ایسی جگہ رک گئی تھی جہاں خوبصورت ریسٹوران اور صاف ستھرا ٹائلیٹ تھا۔ ریسٹوران میں میں نے کافی کا آرڈر دیا تو

ایک شخص نے میرے قریب آ کر کہا "کیا میں آپ کی میز پر بیٹھ سکتا ہوں"

"پلیز" —— ایک معقول اور بردبار سا شخص تھا۔ بتایا۔ میرا نام جگدیش ہے۔ میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہوں۔ دلی کی ایک فرم میں کام کرتا ہوں۔ جے پور سے دورے پر آیا تھا اب اودے پور جا رہا ہوں۔

بھلا سا لگا۔

شام ڈھلنے والی تھی۔ کوچ کچھ دیر کو ایک اور جگہ رک گئی۔ وہاں ٹھنڈی مشروبات' چائے کافی کے علاوہ بھنی ہوئی مونگ پھلی بھی بک رہی تھی۔ میں نے کچھ مونگ پھلی خریدی جگدیش بھی کوچ سے اتر آیا تھا۔ میں نے اسے مونگ پھلی پیش کی۔ اس نے دو چائے کا آرڈر دیا۔ چلو اچھا ہوا کوئی بات کرنے والا مل گیا۔ حالانکہ چاندنی رات میں میرا بائی کے دیش میں سفر کرتے ہوئے مجھے اپنی یکسوئی میں کسی قسم کا خلل پسند نہیں آ رہا تھا۔ میرا بائی برسوں پہلے راجپوتانہ کے صحراؤں میں ڈوب گئی تھی۔

مائے ری میں تو

لیا پیا مول۔

اپنی دھن میں' تان پورا اٹھائے صحرا صحرا' گھاٹی گھاٹی' وادی' وادی گاتی پھرتی تھی۔

درس بن دکھن لاگے نین

جب سے تم بچھڑے پربھو مورے

تب سے نہ پایا چین

درس بن دکھن لاگے نین

میرے دائیں ہاتھ کی سیٹوں پر دو امریکی مرد اور عورت آنکھوں پر اپنی ٹوپیاں رکھے اونگھ رہے تھے۔ جگدیش نے اودے پور کی تعریف کرتے ہوئے کہا بہت حسین شہر ہے۔ وہاں ہر شے سفید ہے۔ اودی اودی۔ ایک ریسٹوران عین جھیل کے بیچ میں ہے۔ کشتی میں بیٹھ کر وہاں جاتے ہیں۔ آپ اودے پور میں کہاں ٹھہریں گی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

"ہوٹل میں"

میں وہاں چند اچھے ہوٹلوں کو جانتا ہوں۔

مگر مجھے زیادہ مہنگا ہوٹل نہیں چاہیے۔

میرے دفتر والوں نے شاید میری رہائش کا انتظام کیا ہو۔ آپ چاہیں تو اسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔

"ہوں۔"

ہماری کوچ میں امریکیوں کا جو سیاحتی گروپ تھا اودے پور میں ٹریول ایجنسی کی طرف سے ان کے لئے ہوٹل بک تھے۔"

میں نے ایک امریکی سیاح عورت سے بات کی تو اس نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو ان کے ہمراہ ہو لوں۔ کوچ نے بریک لگائی تو بہت سے ہوٹلوں کے ایجنٹ موجود تھے۔ میں نے ایک تانگہ لیا تو جگدیش بھی اچک کر اس میں بیٹھ گیا۔ "میرے ہوٹل کا خرچ میرا دفتر دے گا۔ اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ کمرے میں ٹھہر جائیں۔" عمومی مردانہ ذہنیت۔

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ۔" میرے پاس اپنے کمرے کے کرایے کے لئے پیسے ہیں۔ میں نے دل میں کہا میں اس سے بدتمیزی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ رات کے تقریباً" دس بج چکے تھے۔ اس لئے کھانا ملنا مشکل تھا۔ ایک ریسٹوران میں کسی طرح بیرے کو راضی کیا اور دو کھانوں کا آرڈر دیا جگدیش کھسیانا کھسیانا تھا۔ کھانا ختم ہوا میں نے بیرے کو آواز دی۔ "دو بل لاؤ۔ ایک صاحب اور ایک میرا۔ الگ الگ۔"

گوتنگ ڈچ ہم دونوں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس کا کمرہ پہلی منزل پر تھا اور میرا نچلی منزل پر۔ مگر وہ مجھے اس کے بعد نظر نہیں آیا۔ "گوتنگ ڈچ" نے کمال دکھایا تھا۔

ایک امریکی رئیس نے اپنی محبوبہ کی محبت سے سرشار ہو کر ایک بے آب و گیاہ مقام پر محل اور باغات تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تو بہت دور سے پائپ لائنیں بچھا کر پانی لایا گیا۔ سینکڑوں ایکڑ زمین میں پیڑ پودے لگانے کے لئے مٹی لائی گئی۔ اس کی بہت شہرت ہوئی۔ راجپوت راجہ نے شہر بسانا چاہا تو دریا پر بند باندھ کر

allurdupdfnovels.blogspot.com

مصنوعی جھیلیں بنا دیں۔ اور یوں سوکھا بنجر علاقہ سرسبز ہو گیا۔ رات کو اودے پور پہنچ کر یوں لگا جیسے انگلینڈ کے لیک ڈسٹرکٹ میں آ گئے ہوں۔ پانی میں جھلکتی ہوئی چاندنی اور برقی روشنیوں کا ملاپ بڑا دلفریب تھا۔

اودے پور کی صبح دھیمے دھیمے لہجے میں گنگنا رہی تھی۔ وہاں کسی بڑے شہر کا نہ ٹریفک تھا اور نہ ہی شور و غل۔ ہر شے سبک رو تھی۔ اس لئے شہر کی سیر کے لئے کسی تیز رفتار گاڑی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ایک تانگہ ہی کافی تھا کہ اگر میں گلاب باغ میں تصویریں بنانے کے بعد کچھ آگے بڑھوں تو ساگر کا کنارہ آ جائے جہاں سے پارک تک کشتی مل جائے گی۔ میں گجرات کے کسی گاؤں سے آنے والے کنبے کے ساتھ کشتی میں پارک کی طرف روانہ ہوئی تو تانگے کا کوچوان اپنی سیٹ پر اونگھنے لگا اور گھوڑا چارہ کھاتا رہا۔ تانگے والے نے معمولی رقم کے عوض مجھے شہر کی 10-12 جگہوں کی سیر کروانے کا وعدہ کیا تھا۔

راجپوتوں نے مغل بادشاہوں کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں۔ مگر ہار نہ مانی۔ اودے پور کے راجے دھن کے کتنے پکے تھے یہ سب ان کے آرکیٹیکچر سے جھلکتا ہے جب کہ جے پور والوں کے مزاج کی لچک' راجہ مان سنگھ کی مصلحتیں اور مغل بادشاہوں سے رشتے داری' عنبر محل کے شیش محل کی نگاری۔ محرابیں موزیک اور شیشے میں مڑھی ہوئی صحرائیں پھول' پتیاں' جالیاں اور جھروکے۔ یہ مغل فن تعمیر کے اثرات ہیں۔ یورپ کے بروک آرٹ کی طرح شوخ اور چندھیا دینے والی آرائش لیکن مغل فن تعمیر' کنکریٹ کی سختی کو نباتاتی نرمی سے کاٹتا ہے۔ ایک احاطے میں عمارتوں کو مختلف حصوں کی تقسیم سے فاصلہ پیدا کر کے اسے باغات اور راہداریوں سے ملاتا ہے۔ صحن کی گنجائش پیدا ہونے سے ماحول میں نرمی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ وہاں خنبابت اور رنگ تغزل ابھرتا ہے۔ نشاط کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اودے پور کی عمارتیں وقیع' پیچیدہ' بندسی اور کرخت نظر آتی ہیں۔ ایک طویل تسلسل اور اقلیدی موزونیت۔ ایسی بلندی کہ رسائی مشکل نظر آئے۔ مگر سنگ مرمر کی ٹھوس دیواروں کے قدم چومتا ہوا جل کہ تعمیرات کی ساری سختی پانی میں گھلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ تنگ مزاج عمارتیں پانی میں اپنا عکس دیکھ کر

جیسے جھومنے لگی تھیں۔

راجپوت کا مزاج' نرمی و سختی' مروت اور تشدد کا امتزاج۔

سفر کے دوران کبھی کبھار میں بے اختیار ایسی حرکت کر جاتی ہوں کہ بعد میں افسوس ہوتا ہے۔ مثلاً" جے پور کے سٹی میوزیم میں راجپوت پینٹنگز کا ایک پورٹ فولیو سو دو سو روپے میں مل رہا تھا۔ نہیں لیا۔ پھر سہی۔ کہیں اور مل جائے گا۔ مگر وہ اس کے بعد کہیں نہیں ملا۔ اسی طرح "سہیلیوں کی باڑی" کا ٹکٹ لیتے وقت سامنے بورڈ لگا دیکھا کیمرہ اندر لے جانے کے لئے 10 روپے مزید دینے ہوں گے۔ "یہ کیا بکواس ہے۔" ٹھیک ہے میں تصویریں نہیں بناؤں گی۔

اب تک افسوس ہے کہ کیا تھا جو دس روپے دے دیتی۔ ایک خوبصورت جگہ تھی۔ گلاب کے باغات اور بہت سارے مترنم فوارے۔ کوئی ایسا کہے جیسے پھوار پڑ رہی ہو اور کوئی یوں کہے جیسے بوندا باندی ہونے لگے اور پھر تیز بارش کی آواز راجہ کی بیٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہاں آ کر کھیلتی تھی۔ راجہ رانی سنگ مرمر کے کاؤچ پر بیٹھے انہیں دیکھ دیکھ کر نہال ہوتے رہتے۔

یہ بیک وقت ایک طویل اور مختصر دن تھا اتنا کچھ کرنے کو۔ اتنا کچھ کیا۔ اب کیا کریں۔ یہ دن کدھر گیا۔

تپلی گھر میں۔ تپلی شو۔ پتلیاں ناچ رہی تھیں۔ پرانے زمانے کی پتلیاں۔ راجاؤں اور رانیوں کی کہانیاں' مگر اب پتلیاں ماڈرن ہو گئی ہیں۔ وہاں ٹیڈی چاون پہنے پتلی لڑکا' فلمی گانا گاتا ہوا لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا۔ راجستھان کو پتلیوں کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے۔ دھاگے کے زور پر نچائی جانے والی پتلیاں۔ کمزور انسان اور چھوٹے ملکوں کے سیاستدانوں کی طرح۔

امر پیلس کے احاطے میں ہاتھی بے وجہ کبھی سونڈ سے اپنا سر کھجاتے کبھی کان پھڑپھڑاتے مندر کا پجاری گڑوی اور منہ دونوں ایک ساتھ اٹھائے اوپر جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رکا۔ شکریہ۔ بس مجھے ایک تصویر بنانی تھی دوکاندار کا اصرار تھا کہ اگر میں وہ ساڑھی لینے کے لئے تیار ہو جاؤں تو وہ اس کی قیمت کم کر دے گا۔ میں نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا گلدان اٹھایا۔ چاند کی پہلی تاریخ کو درخت کے دامن

allurdupdfnovels.blogspot.com

میں دو محبت کرنے والوں کا ملاپ۔ یہ لوگ ایسی چیزیں سرعام فروخت کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ یہ تو دو روحوں کا ملاپ ہے۔ یا یہ کہ دیویوں اور دیوتاؤں کا ملاپ ہے۔

امر محل کے بیرونی صحن میں واقع کافی شاپ کی ایک میز پر اپنا ٹرانسسٹر رکھے دو سردار جی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والے ٹیسٹ میچ کی کمنٹری سن رہے تھے۔ ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "اودے پور منی کشمیر ہے۔" اس کے ساتھی نے اس کی حمایت کی۔ صبح سے شام ہوگئی تھی۔ اودے پور نے مجھے بار بار اس بات پر اکسایا تھا کہ میں سردار جی کے اس دعوے کا یقین کرلوں۔ مگر مجھے تو وہ اس وقت ایک جادوگری لگ رہی تھی جسے چاروں طرف سے دیوؤں نے گھیر رکھا ہو اس لئے اس سے باہر نکلنے کا راستہ بہت دشوار تھا۔ میں نے صبح انفارمیشن کے دفتر میں بڑی مغز ماری کی تھی یہ جاننے کے لئے کہ آخر اورنگ آباد تک کیسے پہنچا جائے۔ احمد آباد جایا جائے یا سورت جایا جائے اور وہاں سے ٹرین لی جائے۔ مگر اورنگ آباد برانچ لائن پر ہے۔ دو صورتیں ہو سکتی ہیں کہ جل گاؤں پر اتر کر اورنگ آباد کی ٹرین لے لی جائے۔ یا پھر من ماڑ سے وہاں کی ٹرین لی جائے۔ عجیب گھن چکر تھا۔

"تم ماضی کے آثار میں بنی نوع انسان کا پورا مستقبل پڑھ سکتے ہو۔" پروفیسر نے کہا "تم ذرا غور کرو' پیٹے ہزاروں سال پہلے وہ لوگ میرے اور تمہاری طرح کے ہی تھے' خواب دیکھتے ہوئے' کہانیاں کاتتے ہوئے' زندگی بسر کرتے ہوئے' ہمارے آباؤ اجداد کو جنم دیتے ہوئے۔"

اورنگ آباد جانے والی ٹرین میں۔ صبح کا ڈیڑھ بجا تھا۔ میرے ہاتھ میں سیڈنی شیلڈن کا ناول "اف ٹو مورو کنز" تھا۔ یہ بالکل اتفاق تھا کہ جب ناول کا کردار آرکیالوجسٹ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ سطور کہہ رہا ہوتا ہے تو پلیٹ فارم کے ایک بورڈ پر نظر پڑی "ایلورا" اجنتا کی غاروں اور فریسکوز کو دیکھنے کے لئے یہاں پر اتریں۔"

لیکن مجھے تو اورنگ آباد جاکر ہی اترنا تھا۔ کل رات ساڑھے آٹھ بجے اودے پور کو چھوڑا تھا۔ اودے پور کے افسوں سے نکلنے کی یہی ایک صورت بنی کہ میں ٹی وی کوچ سے سورت روانہ ہو جاؤں۔ یہ سن 86ء کا ذکر ہے۔ اس وقت تک عوامی بسوں میں ٹی وی نہیں لگے تھے۔ ٹی وی کوچ کیا ہوتی ہے۔ کیا کوئی ایسی کوچ ہے۔ جس کے مسافر پورا وقت ٹی وی پر نظر آتے رہتے ہیں۔ لندن نیویارک کے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹورز کی طرح۔ سامنے کی نشست پر بیٹھا ڈرائیور باخبر رہتا ہے کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ یعنی اس نے نیند کی بے خبری میں اپنا سر ساتھی مسافر کے کندھے پر رکھ دیا۔ یہ بھی پتہ چلتا رہتا ہے کہ مسافروں کا سامان اپنی اپنی جگہ پر محفوظ ہے۔ کہیں رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر کسی نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کی۔ ہندوستان میں ٹورسٹ سسٹم تو اچھا ہے ہی لیکن یہ لوگ اس قدر ایڈوانس ہو جائیں گے کہ کوچز میں ایسے کیمرے نصب کردیں گے۔ میں نے اس کی وضاحت

allurdupdfnovels.blogspot.com

طلب نہیں کی تھی لیکن رات کو جب کوچ اودے پور سے روانہ ہوئی اور کچھ دیر بعد امیتابھ بچن کی فلم چلنے لگی تو سمجھ میں آیا کہ دراصل ٹی وی کوچ کیا ہے۔ بہرحال یہ انتظام بھی اپنے طور پر اچھا تھا۔ جو مسافر سو نہیں سکتے یا سونا نہیں چاہتے وہ فلم دیکھتے رہیں۔ افسوس کہ ایئر فون کا سسٹم لگانے کی غفلت ان سے سرزد ہو گئی تھی۔ ورنہ سونے والے مسافر تو سو سکتے تھے۔

میرے ساتھ کوچ کمپنی کا ہی کوئی شخص تھا۔ وہ اس کے علاوہ کون تھا۔ کیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں۔ اتنا شریف ضرور تھا کہ مجھے رات کو خدا جانے کیا وقت اور کہاں پر پیاس لگی تو اس نے کوچ رکوائی تاکہ میں کچھ بوتل وغیرہ خرید سکوں۔ رات کا سفر کرنے کا فائدہ یہ کہ بہت سارے کٹھن راستے کٹ جاتے ہیں۔ فاصلے غفلت میں کم ہو جاتے ہیں۔ ورنہ کوچ سے اودے پور سے سورت کا بارہ گھنٹے کا سفر دن کے وقت کرنا پڑتا تو بڑا لمبا لگتا۔ میں خود کو جی ہی جی میں کوستی کس نے کہا تھا کہ ایسے کام کرو۔ مگر اس پر نقصان یہ ہوتا ہے کہ بہت سارے مناظر اوجھل ہو جاتے ہیں۔

صبح کی روشنی پھیلی تو پتہ چلا کہ کوچ راجستھان کی حدود پار کر کے گجرات جو اب سوراشٹر کہلاتا ہے کے علاقے میں داخل ہو چکی ہے۔ سرسبز زرعی علاقہ۔ تا حد نظر کھیت ہی کھیت' کسانوں کے گھر۔ مگر ایک منظر دیکھ کر تو میرا دل بند ہوتے ہوتے رہا۔ بے یقینی کے عالم میں دراصل ایک شخص بالکل ہی مختلف ماحول سے آیا ہو تو وہ لمحہ بھر کو ضرور بوکھلاتا ہے میری جگہ کوئی مرد ہوتا اور وہ بھی میرے ہی جیسے کسی ملک سے آیا ہوتا تو وہ بس والے سے یہ کہہ کر "مجھے پیاس لگی ہے" اور بس سے اتر جاتا۔ ہوا یہ کہ صبح سویرے کھیتوں میں ایسی عورتیں نظر آئیں جنہوں نے گھٹنوں گھٹنوں تک شارٹس یعنی "کچھے" پہن رکھے تھے۔ ان کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہاں کوئی اشتعال انگیزی بھی مقصود نہ تھا وہ غریب کسان عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ مزدور عورتیں تھیں۔ ایسے ہی جیسے چٹا گانگ کے ہل ٹریکس میں بلاؤز کے بغیر صرف ساڑھی لپیٹے عورتیں نظر آتی ہیں۔

کوچ سورت کے قریب پہنچنے لگی تو ہوا میں کچھ سیلن سی آ گئی۔ راجستھان

کی پتھریلی سطح مرتفع اور صحرا کے بعد اس نمی نے واضح طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ مجھے سورت میں رکنا نہیں تھا۔ وہاں اتر کر بس ٹرین لینی تھی۔ کوچ شہر میں داخل ہو رہی تھی تو سائیکلوں پر کچھ بچے سکول جاتے نظر آئے۔ بس کے قریب سے گزرے تو خوش ہو کر ہاتھ ہلائے۔ ان کی یہ خوش دلی اچھی لگی۔ بس ایک پل پر سے گزر رہی تھی۔ یہ نہ نہر تھی۔ نہ دریا۔ بلکہ کھاڑی تھی۔ اسپوری سمندر کی ٹھنکائے۔ کھلے سمندر سے تجاوز کر کے خشکی میں گھسنے والی سوالی کھاڑی۔ پانی اترا ہوا تھا اس لئے سیاہی مائل گیلی گیلی سطح پر کچھ گھونگے اور سیپیاں دکھائی دیں۔

یہ کھاڑی' جس پر انگریزوں نے پرتگالیوں کو شکست دی تھی۔ ڈرائیور سے درخواست کی کہ وہ مجھے ریلوے اسٹیشن کے قریب کہیں اتار دے۔ اس نے بھرے بازار میں بس روک کر کہا کہ یہیں اتر جائیں۔ اور ریلوے اسٹیشن تک کے لئے کوئی سواری لے لیں۔

من ماڑ جانے والی ٹرین لینے تک میرے پاس صرف اتنا وقت تھا کہ میں ویٹنگ روم میں منہ ہاتھ دھو کر کسی ٹی اسٹال سے ایک پیالی چائے خرید سکوں۔ اور پھر اس شہر کو جو ہندوستان میں بہت ساری گڑبڑ کرنے' اس کی تاریخ کا رخ موڑنے' مغل بادشاہت کے زوال کا بندوبست کرنے کا ذمہ دار تھا اسے ایک نظر سے دیکھ کر آگے بڑھ جاؤں۔ سورت جو ایک زمانے میں عرب اور خلیجی ممالک کے ساتھ تجارت کی اہم بندرگاہ تھی۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا ہیڈ کوارٹر تھا۔

اورنگ آباد جانے والی گاڑی میں خاصا ہجوم تھا۔ بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن وہ بھلا سا آدمی' جو شکل و صورت سے پڑھا لکھا دکھائی پڑتا تھا۔ اس نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے مجھے کہا میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا آپ بیٹھ جائیں۔

اس سے قبل سورت سے من ماڑ تک میں نے مدراس ایکسپریس سے سفر کیا تھا۔ مدراس ایکسپریس میں سوار ہوتے ہی مجھے ایک دم کچھ احساس ہوا کہ جیسے کچھ کھو گیا ہے۔ نہیں۔ میرا تمام اسباب محفوظ تھا اور میں بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ دراصل مجھے سے ان لوگوں کا ساتھ چھوٹ گیا تھا جو کسی نہ کسی روپ میں آگرہ'

allurdupdfnovels.blogspot.com

کھجوراؤ' دہلی' جے پور' اودے پور ہر جگہ موجود تھے۔ سیاح اپنے گھروں کا آرام چھوڑ کر سفر کی نا آسودگیوں کو گلے لگائے زندہ دل' متجسس لوگ۔ شاید میرا روٹ ہی ایسا تھا۔ جہاں ہر جگہ' ہر شے مقامی رنگ لئے ہوئے تھی۔ سورت ریلوے اسٹیشن پر گاڑی میں سوار کروانے والا قلی۔ کم محنت کرکے زیادہ پیسے ہتھیانے کی خواہش رکھنے والوں میں سے ایک۔ بدتمیز۔

من ماڑ _ انگریزی میں ریلوے اسٹیشن کا نام مین میڈ لکھا ہوا تھا۔ جیسے ہندوستان میں من ماڑ پڑھا جاتا ہے۔ مدراس ایکسپریس میں سوار ہوئی تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ڈبے میں جتنے مرد یا عورتیں تھیں وہ کھانے پینے میں اس قدر مشغول کہ اگر اس وقت زلزلہ بھی آجاتا یا خدانخواستہ ریل گاڑی کا حادثہ ہوجاتا' یا گاڑی پر آسمانی بجلی گر پڑتی تو بھی وہ اسی طرح اپنے گھٹنوں پر کھانے کی ٹرے رکھے یا فلن کے ڈبوں میں ہاتھ مارتے' کھاتے ہی رہتے۔ سارے کے سارے مدراسی سفید دھوتیوں اور کرتوں میں سے جھانکتے ہوئے کالے کالے سر۔ بے مروت سے چہرے۔ گاڑی خراٹے بھر رہی تھی۔ کھڑا ہونا مشکل تھا۔ برتھ کے ایک کونے پر ایک شخص بیٹھا اپنا بھوجن ہڑپ کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں۔ "نہ نہ ریزرو ہے۔" کم بخت۔ اتنا بھی نہیں جانتا کہ دن کے وقت ریزرو برتھ پر دوسرا کوئی مسافر بخوشی بیٹھ سکتا ہے۔ ایک انگریز ٹورسٹ نظر آیا۔ وہ بھی میری ہی طرح بیٹھنے کی جگہ نہ مل سکنے پر ادھر سے ادھر جا رہا تھا۔ شکر ہے۔ اپنی عارضی برادری' کا کوئی فرد نظر آیا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ ریل کے گارڈ کے پاس چلتے ہیں۔ اس کے پاس ہمارے مسئلے کا ضرور کوئی نہ کوئی حل ہوگا۔ بخوشی مان گیا۔ ہم نے پوری ٹرین گھوم کر بالآخر گارڈ صاحب کو جالیا۔ پاسپورٹ دکھا کر اپنی مشکل بتائی اور انہوں نے فوراً" چیکر کو بلا کر ہمارے لئے سیٹ کا انتظام کر دیا۔ رات بھر کوچ میں بیٹھ گزری تھی۔ اور اب سیٹ کی تلاش کا چکر ریل کی کنٹین کا بیرہ معذرت کر رہا تھا کہ اس وقت صرف نان ویج کھانا ہی مل سکے گا۔ ہندوستان کی سبزی خور آبادی نے ریلوے کنٹین کے تمام ویج کھانے ختم کر دیئے تھے۔ ارے بابا اس وقت تو تم کچھ بھی لادو۔ سب چلے گا۔ اس کے کچھ دیر بعد بالائی سیٹ سے

اٹھنے والے خراٹوں سے ڈبے میں اونگھنے والے مسافروں کے بہت سے خواب گڈمڈ ہوگئے ہوں گے۔ من ماڑ سے مجھے اورنگ آباد کے لئے ٹرین لینی تھی۔

مدراسیوں سے بھری مدراس ایکسپریس من ماڑ کے اسٹیشن پر پہنچی تو اورنگ آباد جانے والی گاڑی سگنل سے باہر نکل چکی تھی۔ دھت ترے کی' اب کیا کروں۔ ریلوے والوں کی اطلاع تھی کہ اورنگ آباد کے لئے اگلی گاڑی رات کے ڈیڑھ بجے ملے گی۔ 5 گھنٹے من ماڑ ریلوے اسٹیشن پر بھی ریسٹوران میں بھی ویٹنگ روم میں۔ کبھی پلیٹ فارم پر ریل کی خالی پٹریوں کو دیکھتے ہوئے۔ کسی نہ کسی طور کاٹ لئے۔ ریلوے اسٹیشن بھی ایسا کہ گھنٹوں کوئی گاڑی نہ آتی۔ ورنہ آتے جاتے چڑھتے اترتے مسافر اچھا خاصا رونق میلہ لگا دیتے ہیں۔

اب جو میں لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھی تو ایک عورت مل گئی۔ وہ اپنے صندوق پر بیٹھی تھی۔ غریب سی سادہ سی عورت اسے بمبئی جانا تھا۔ خود ہی باتیں کرنے لگی۔ اسے بتایا کہ میں اورنگ آباد میں دو دن رکنے کے بعد ٹورسٹ کوچ سے بمبئی جاؤں گی۔

"نہیں" اس نے مشورہ دیا "ٹورسٹ کوچ مہنگی پڑے گی۔ آپ عام بس سے جائیں وہ سستی ہے۔"

ترقی پذیر دنیا کے غریب لوگوں کے سستے مشورے _ کم آمدنی اور کھانے والے جی زیادہ۔ وہ ہمارا اشٹر ٹوریزم کے ڈرائیور کی بیوی تھی۔ اسی نے اپنی بیوی کو بتایا ہوگا کہ اس کی بس میں دنیا بھر کے امیر سیاح سفر کرتے ہیں۔ وہ یقیناً" اپنے بیوی بچوں کو اپنی کوچ میں بیٹھا کر کہیں نہیں گیا ہوگا۔

میں نے اس کی بات جیسے مان لی۔ حالانکہ اس وقت میرا "ایڈونچر زم" خاصا ڈول رہا تھا۔ میں گزشتہ 30 گھنٹوں سے بغیر کہیں قیام کئے مسلسل سفر میں تھی۔ اب جی چاہ رہا تھا کہ سفر کا اگلا اور آخری مرحلہ آرام سے کاٹا جائے۔

حالانکہ مسلسل سفر کا اپنا مزہ ہے۔ ہر ساکت شے حرکت میں آجاتی ہے۔ ریل کی کھڑکی سے باہر نظر آنے والی ہر شے مکان' پیڑ' کھلیان' روشنیاں' خود چل رہے ہوں تو زمانہ چل رہا ہوتا ہے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اورنگ آباد ریلوے اسٹیشن رات کا پچھلا پہر ساڑھے تین بجے تھے۔ ہر شے سو رہی تھی سوائے ریلوے اسٹیشن کے قلیوں کے اور بکنگ کلرک کے۔ قلی سے پوچھا کہ کیا یہاں کوئی ٹورسٹ انفارمیشن کا دفتر ہے۔ نہیں تھا۔ پروگرام بہت ٹائٹ ہو رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں رکا نہیں جا سکتا تھا۔ میں خود کو ویٹنگ روم کی ٹھنڈی ٹھنڈی بید کی کرسیوں کے سپرد کرنے کو تیار نہ تھی۔ کیوں کہ مجھے بہرحال صبح ایلورا کے لئے ٹور لینا تھا۔ چلیں ٹھیک ہے۔ آٹو رکشا ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے کسی ہوٹل میں کمرہ چاہئے۔" میرا خیال تھا کہ میں اب تک 'ہندوستان میں تقریباً" 5-6 ہفتوں سے گھوم پھر کر بہت تجربہ کار ٹورسٹ بن چکی ہوں۔

ڈرائیور نے سامان رکھا' کک ماری اور پھڑ پھڑ کرتا ہوا آٹو رکشا دوڑانے لگا۔ ہوٹلوں کے بند دروازوں کے سامنے سے' اونچے اونچے درختوں کے قریب سے' کھلی کھلی سڑکوں پر سے گزرتا ہوا۔ کہیں نہیں رکا۔ بس چل رہا تھا۔ پھر وہ تنگ ویران گلیوں میں گھس گیا۔ کئی موڑ مڑا۔ چلتا رہا۔

تجربہ کار ٹورسٹ کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ کہا تھا باز آجاؤ۔ مت ایسی حرکتیں کرو۔ ارے یہ لوگ۔ چھوٹی چھوٹی جگہوں پر رہنے والے۔ ٹورسٹ و ورسٹ کچھ نہیں جانتے۔ چھوڑو اپنی پھنے خانی۔ دیکھو۔ اب یہ تمہیں کہاں لے جا رہا ہے۔ رات کے پچھلے پہر۔ چل ٹھیک ہے دیکھا جائے گا۔ جب کچھ بن نہیں پڑتی تو منہ سے ایسے ہی جملے نکلتے ہیں۔

رکشا ویران سی گلی کے ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ ڈرائیور نے دروازے کے قریب جا کر گھنٹی بجائی۔

"الو کا پٹھا۔ یہ کہاں لے آیا ہے۔"

تھوڑی دیر میں تہمند باندھتا ایک شخص باہر نکلا۔

"پسنجر لایا ہے صاحب"

اس نے اپنی خواب آلود آنکھوں سے رکشا میں بیٹھی سواری اور سامان پر نظر ڈالی۔

"فل ہے۔ کوئی جگہ نہیں" ادھ موئی آواز۔

"اچھا" __ ڈرائیور مایوس ہو کر رکشا کی طرف پلٹا۔ اور رکشا اسٹارٹ کر دیا۔

شیر پھنکارا _ "یہ کیا جگہ تھی۔"

"لاج ہے جی۔ مگر فل ہے۔"

"اوفو۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ مجھے کسی لاج میں نہیں بلکہ ایک ہوٹل میں ٹھہرنا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ لاج میں پسنجر لانے پر جو کمیشن ملتا ہے اس کے جانے کا افسوس کر رہا ہوگا۔

ایک ہوٹل کے آہنی گیٹ کے سامنے چوکیدار اونگھ رہا تھا۔ سوال کا جواب تھا۔ "بالکل فل ہے۔"

اورنگ آباد کو آج کیا ہو گیا۔ سارے ہوٹل اور لاجز فل ہو گئیں۔

دوسرے ہوٹل کے سامنے۔ ہارن' گھنٹیاں چوکیدار ہڑبڑا کر گیٹ کی طرف لپکا۔ داڑھی والا چوکیدار پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا لہجہ اور حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔

شاید وہ بھی میرا لہجہ بھی پہچان گیا تھا۔ گیٹ کھولا۔ سامان رکشا سے نکالا۔ پوچھا۔ "کیا آپ پاکستان سے آئی ہیں۔" یہ سوال دوسری بار ہوا تھا۔

"ہاں بابا جی۔"

ہوٹل کا مینجر اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔ چوکیدار نے رجسٹر میں میرے سامنے کھولا اور کہا کہ اس پر اپنا پاسپورٹ نمبر اور پتہ لکھ دیں۔

وہ مجھے ایک کمرے میں پہنچا کر پلٹا۔

نہیں۔ مجھے صبح ایلورا جانے کے لئے بس لینی ہے۔ کتنے بجے جائے گی؟

"صبح ساڑھے آٹھ"

"ٹھیک آپ مجھے آٹھ بجے چائے دے دیں۔"

پھر مجھے نہیں معلوم کہ وہ جگہ کونسی تھی۔ کہاں تھی اس وقت تک جب

allurdupdfnovels.blogspot.com

تک کہ دروازے پر دستک نہ ہوئی۔ ورلڈ نیوز سروس سے خبر نشر ہو رہی تھی ایک خلا باز نے نہایت دلیری اور ہوشیاری سے شدید تکنیکی خرابی کے باوجود اپنا خلائی طیارہ بحفاظت زمین پر اتار لیا۔

گزشتہ شب کے ایڈونچر کے بخوبی طے ہونے پر "اف اللہ۔ اگر لاج فل نہ ہوتی تو!!"

دروازہ کھولا تو چائے کی ٹرے ہاتھ میں لئے بیرہ کہہ رہا تھا "ایلورا کے لئے بس 10 منٹ میں روانہ ہوگی۔" اورنگ آباد ٹورسٹ سروس شیرن امریکہ سے اکیلی چلی تھی۔ ہندوستان کے ٹرپ پر۔ مگر اسے اکیلے سفر کرنا پسند نہیں تھا۔ بہت سے لوگوں کی طرح وہ چاہ رہی تھی کہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا تو اسے بڑا مزہ آتا۔ میں اسے کہہ رہی تھی اگر کوئی میرے ساتھ ہوتا تو مجھے بالکل مزہ نہ آتا۔ سارا مقصد برباد ہو جاتا۔

وہ متجسس نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کوچ ایلورا روانہ ہو چکی تھی۔ اس میں تقریباً" سارے کے سارے مسافر امریکہ برطانیہ نیوزی لینڈ اور چند جنوب مشرقی ممالک سے آنے والے سیاح تھے۔ دیکھو اگر کوئی میرے ساتھ ہوتا۔ گھر سے لایا ہوا تو ہم دونوں آپس میں ہی بات کرتے رہتے۔ پھر تم سے ملاقات نہ ہوتی۔ میرا مشاہدہ کمزور ہو جاتا۔ پھر بھلا گھر سے' اپنے روز مرہ کے گرد و پیش سے باہر آنے کا کیا فائدہ قریب میں کوئی شناسا بیٹھا ہو تو وہ اس قدر مشغول کر لیتا ہے کہ باہر والوں کی بہت سی باتیں سنائی نہیں دیتیں' کئی چیزیں دکھائی نہیں دیتیں۔

شیرن میری بات سمجھ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی سی کتاب تھی۔ ایلورا' اجنتا پر۔ وہ جب چھوٹی سی تھی تو اس کے ماں باپ ہندوستان آئے تھے۔ ماں نے کہا تھا تم جب بڑی ہو جاؤ گی اور تمہیں موقع ملے تو ایلورا اجنتا ضرور جا کر دیکھنا۔ یہ کتاب اس کی ماں نے اس وقت خریدی تھی۔

ایلورا کے غار اورنگ آباد سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ اس لئے ٹوریزم والوں نے ایلورا کے علاوہ اور بہت سی جگہیں دن بھر کے ٹور میں شامل کر لی تھی۔ اورنگ آباد جو کبھی دکن میں شامل تھا اب مہاراشٹر کا ایک ضلع ہے۔

اورنگ زیب کی کچی قبر' پرانی پن چکی' اور تاج محل کی مضحکہ خیز پروڈی بی بی کے مقبرہ کا شہر پہلے اس کا نام کھڑکی' بھلا کیوں تھا۔ شاید یہ گیٹ وے آف انڈیا بمبئی کی طرح دکنی علاقے کی لکڑی کی ہو۔ جے دیو گری' دیو ناؤں کی پہاڑی تھی۔ اسے محمد تغلق نے دولت آباد بنا دیا تھا۔

دولت آباد کا قلعہ ہی اس روز کا پہلا پڑاؤ تھا۔ وسیع اور پیچ در پیچ بنا قلعہ۔ قلعے کی اندھیری کوٹھری میں قلعے کا چوکیدار اگر لالٹین نہ جلاتا تو اس گھپ اندھیرے میں یوں لگتا کہ اورنگ آباد کے محکمہ سیاحت نے ہمیں کسی تاریک قبر میں پھینک دیا ہے کہ اب بولو' ایلورا' اجنتا کے غار دیکھنے کی ضد چھوڑو گے کہ نہیں۔

محمد تغلق نے ساری دلی کو حکم دیا تھا کہ چلو' دولت آباد چلنے ہیں۔ ہزاروں مردوں' عورتوں بچوں بوڑھوں' جوانوں کا قافلہ یہاں پہنچا تو خیال آیا کہ یہ تو اس کی دیگر تمام حماقتوں میں سب سے بڑی حماقت تھی۔ حکم ہوا واپس دلی چلو۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دولت آباد میں بسنے کا محمد تغلق کا فیصلہ اور فتح پور سیکری جانے کا شہنشاہ اکبر کا فیصلہ دونوں میں سے سب سے زیادہ غلطی پر کون تھا۔ اکبر یا محمد تغلق۔ اکبر نے فتح پور سیکری کے قلعے کی تعمیر میں بے اندازہ دولت لٹائی اور محمد تغلق نے دولت آباد کو دارالحکومت بنانے کی خواہش میں 40 روز تک سینکڑوں میل کا سفر کرنے والوں کی جانیں لٹائیں۔

قلعے کے سامنے کھڑے ہو کر نظر ڈالی تو تاریخ کے کتنے ورق ایک ہی فریم میں سمٹ آئے۔ یہ وسیع و عریض قلعہ راجہ بھلم راج جو ایک جرنیل تھا' نے تعمیر کیا تھا۔ دو پتھریلی چٹانوں کی نگرانی میں داخلی دروازے کی محراب اور بالائی منظر کے ستونوں اور برآمدے کے سے کھلے دروازوں کے پس منظر میں الٹتا ہوا چاند مینار علاؤالدین احمد شاہ بہمانی کی فتح کی یادگار۔ قلعے کے بیرونی صحن اور دیواروں میں نصب بے شمار بڑی بڑی توپیں ٹھنڈی پڑی تھیں۔ قلعے کے سامنے لکڑی کے بنچوں پر بیٹھے کچھ لوگ چائے پی رہے تھے اور ایک بیل گاڑی بھوسے سے لدی گزر رہی تھی۔ وقت کا پہیہ چل رہا تھا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

یہ لڑکی اور اس کے ساتھ نوجوان لڑکا۔ یہ دونوں اس سے پہلے نظر نہیں آئے۔ یہ سیاح نہیں تھے۔ اس لئے بس میں سوار ہو کر کسی کونے میں بیٹھے رہے۔ انہیں دولت آباد کے قلعے' توپوں اور چاند مینار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لڑکی نے کچا ناریل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ بس سے اتری اور مندر کی طرف چل دی۔

میں بھی اس کے ساتھ ہولی۔ "سنو' یہ کیا ہے' یعنی یہ کچا ناریل کیا کرو گی۔"

یہ مندر کا چڑھاوا ہے۔ جن عورتوں کے ہاں بچہ نہیں ہوتا۔ وہ یہاں منت مانتی ہیں۔ اوہ' اچھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یعنی کوئی انوکھی بات نہیں۔ دنیا کی ہر عورت کے لئے "ماں" بننے کی خواہش' بے اولادی کی صورت میں شوہر کے ساتھ بندھن ٹوٹنے کا خدشہ۔ سسرالیوں کا تقاضا۔ عورت بے بس ہو جاتی ہے وہ ہر طرح کے سہارے ڈھونڈتی ہے۔

جمیل دہلوی کی فلم اسکولیٹ کیکیشن پیروں فقیروں کے تعویز گنڈے اور ہتھکنڈے پتہ نہیں اس لڑکی بے چاری نے کچے ناریل کا کیا کیا۔ ہم سب' میں اور چند دیگر ٹورسٹ گھرانیشور مندر کی سیڑھیوں کے پاس رک گئے کہ شاید غیر ہندوؤں کے لئے مندر کے اندر داخل ہونا منع ہو تو پنڈت جی نے بلایا کہ آگے بڑھو اور ماتھے پر سیندور کا تلک بھی لگا دیا۔ اس وقت وہ لڑکی' بچے کی آرزو میں پنڈت جی کے قریب دو زانو بیٹھی تھی اور پنڈت جی اس پر منتر پڑھ کر پھونکیں مار رہے تھے۔

شیرن' شیشل کی ایک کارپینٹر تھی۔ سلجھی ہوئی لڑکی۔ اپنے بارے میں شیشل سے کہا کہ وہ ایک مرد کے ساتھ رہتی ہے۔ مگر وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس سے یہ جھنجھٹ نہیں پالا جاتا کہنے لگی۔ "میرے والدین بہت اچھے ہیں۔ وہ مجھے شادی پر مجبور نہیں کرنا چاہتے۔"

ایک سوال اٹھا۔ غار مندر کیوں بھلا؟

بے آباد علاقوں کے غار دنیا سے اوجھل ہونے اور چھپنے کے لئے بہترین تھیں۔ بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ۔ نہیں یہ کافی نہیں۔ عبادت کی یکسوئی۔ خلل کے بغیر ریاضت کی خاطر۔ اس کے علاوہ کچھ اور وجوہ بھی ہیں۔ قدیم انسان کو جدید

دور کی سہولتیں میسا نہ تھیں۔ وہ ایسی پناہ گاہ تلاش کرتا تھا جو آرام دہ ہو۔ سردی میں گرم رہے اور گرمی میں ٹھنڈی۔

ایسی جگہ جو مستقل ہو۔ اس میں جمالیاتی اکائی کی تمام تر خصوصیات ہوں۔

ایک متجسس سوال کے جواب میں مختلف توجیہات۔

ایک یہ بھی کہ ہندوستانی معاشرے اور تہذیب و تمدن میں' نظام حیات میں نوسٹلیا یا ماضی کی جانب بازگشت کا عمل دخل نمایاں ہے۔ بیابان جنگلوں پر غاروں اور جنگلوں کی تاریکی اور تنہائی کی طرف جانا دراصل اپنے شعور کے پوشیدہ گوشوں تک رسائی کی علامت تھا۔ اپنے اندر کی تلاش ایلورا کے غاروں کے سامنے کی جگہ دھول سے اٹی ہوئی تھی۔ موسم خشک تھا۔ ایک بڑے ہال سے گزرتے ہوئے بدھ کا طویل قامت مجسمہ دیکھا تو لگا جیسے سدھارتھ دربار لگائے بیٹھے ہوں۔ ہال کی چھت کی کڑیاں' پتھر سے تراشی ہوئی مگر لکڑی جیسی گو تھک کتھیڈرل سے مشابہت بدھ کے مجسمے کو ایک طرف سے دیکھیں تو چہرے پر متانت بسی ہوئی اور دوسری طرف سے نظر ڈالیں تو مسکراہٹ کھلی ہوئی۔ سنگتراش نے ہر دو تاثرات پیدا کئے تھے۔ قصداً" یا یہ سب اتفاقیہ تھا!

توقع یہی ہے کہ ایسا محض حادثاتی طور پر ہوا۔ مجسمہ ساز اپنی دھن میں کام کرتا رہا۔ ممکن ہے کہ مجسمے کی تکمیل کے بعد اسے یہ خبر بھی نہ ہوئی ہو کہ اس نے ایسا فن پارہ تخلیق کیا ہے جس میں دو متضاد تاثرات یکجا ہو گئے ہیں۔ کھجوراہو ہی کی طرح ایلورا میں بدھ' ہندو اور جین مت کی عبادت گاہیں ایک ہی حلقے میں موجود ہیں۔ ایک دوسرے کے عقیدے کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور اظہار کی رعایت۔ البتہ بدھ مت اور ہندو دھرم کے مجسمے اور تعمیرات جین مندروں کی بہ نسبت زیادہ وسیع اور شاندار ہیں۔ ہر ایک عقیدے کے پھیلاؤ اور مقبولیت کے مطابق ہمارے گروپ کے ارکان ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ کوئی تصاویر اتارنے میں مصروف تھا کوئی کسی ٹیلے پر بیٹھا سستا رہا تھا۔ حیرت اور تعجب سے غار مندروں کا نظارہ کر رہا تھا ایلورا کی غاریں جو عبادت گاہوں کے علاوہ راہبوں' بھکشوؤں

allurdupdfnovels.blogspot.com

اور ساہنوں کی رہائش گاہیں بھی تھیں وہ دو اور تین منزلہ ہیں۔ مگر وہاں جو کچھ بھی تھا وہ وہیں کا ہے۔ تاج محل، لال قلعہ، فتح پور سیکری ان سب تعمیرات میں پتھر میلوں دور سے لایا گیا تھا۔ جب کہ ایلورا کی غاروں کی تمام تعمیرات، ستون، چھتیں، فرش، چبوترے، سب کے سب تراشے گئے ہیں۔ تعمیر نہیں کئے گئے۔ کھودے گئے ہیں۔ جوڑے نہیں گئے۔

شیرن کا اصرار تھا کہ غار کی بالائی منزل ضرور دیکھی جائے۔ میں پتھر کے ایک چبوترے پر بیٹھی کل صبح 5-4 بجے ختم ہونے والا اپنا مسلسل 36 گھنٹے کا سفر یاد کر رہی تھی۔ "نہیں مجھ سے سیڑھیاں نہیں چڑھی جاتیں۔" اس نے اس طرح دیکھا کہ اٹھنا پڑا۔ وہ بھی ایرک اور ایلورا کی طرح یہی کہتی کہ اتنی دور آگئیں اور اب سیڑھیاں چڑھنے سے معذرت کر رہی ہو۔

مگر اس کے بعد میں نے اس کی بات نہیں سنی۔ گائیڈ نے اطلاع دی کہ اب بدھ مندر ختم ہو گئے ہیں۔ غار مندروں کی اس قطار میں آگے ہندو مندر اور بعد میں جین مندر ہیں۔ میں آگے بڑھی۔ مجھے اس جگہ کے بارے میں پہلے سے کوئی علم نہ تھا۔ میرے قدم ٹھٹھک گئے۔

پتھروں کا خوبصورت باغ ۔ کئی سمتیں، کئی گوشے، کئی زاویے، مجسمے، مکانیت اشکال کی زبان سے دیومالائی داستان سرائی ۔ ہاتھی، ندی، راون، شیو، پاروتی، محبت، قوت، اچھائی، بدی کی علامتیں۔

وہ کیلاش مندر تھا۔ ہمالیہ کی بلندیوں پر واقع، ہندو مائی تھولوجی کے مطابق شیو کے دائمی مسکن کی شبیہ وسیع اور مفصل۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی مونو لیتھک، یعنی یک سنگی یادگار ہے ہندوستان کے قدیم سنگتراش اور مجسمہ ساز یونانی سنگتراشوں کی مانند شاعر، ادیب یا مفکر نہیں تھے۔ وہ محض کاریگر تھے۔ محنت کش دستکار جو راہبوں اور پنڈتوں کی زیر ہدایت اور ان کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ نیز یونانی مجسمہ سازی میں جمالیاتی پہلو نمایاں ہے۔ جب کہ ہندوستانی مجسمہ ساز ایک روایت کو دوہرانا چاہتا تھا۔ اس کے فن نے کوئی اختراع نہیں کی اور نہ ہی اس میں کوئی جدت کو پیدا کرنا مقصود تھا۔ وہ اپنی روایت کو ثقافت کا مستقل جزو بنانے کا آرزو

مند تھا۔ مگر کیلاش مندر کی لینڈ اسکیپنگ ایسی ہے جیسے پتھر کو جوہر بنا دیا ہو۔ جیسے زرخیز مٹی میں آب و ہوا کی مناسبت سے بوئے ہوئے بیج اور پانی سے ہری بھری فصل تیار ہو جاتی ہے۔ عام اندازہ ہے کہ اس عظیم چٹان کی تراش میں تقریباً" سو برس کی مدت صرف ہوئی۔ سینکڑوں افراد کی محنت مشقت، ذہانت اور مہارت کی مثال۔ جذبے کی صداقت، شدت و گہرائی سے تخلیق کیا گیا بے نظیر شاہکار۔

اجنتا کی طرح ایلورا کے غار مندر کبھی گم نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ آتے جاتے زمانوں کے سامنے رہے اس طرح وہ بے توجہی کا شکار ہونے سے محفوظ رہے۔ جہاں آمد و رفت کی کثرت سے نوٹ پھوٹ ہوتی ہے تو اس کی مرمت بھی ہوتی رہتی ہے۔

ممتاز محل کے لئے شاہجہان کی محبت بے پناہ تھی بہت سچی، بہت گہری۔ تاج محل کی تخلیق اس کا اصل تھا۔ جب کہ اورنگ زیب کا تعمیر کردہ بی بی کا مقبرہ اصل کی نقل ہے۔ ایلورا سے اورنگ آباد واپسی پر اگلا اسٹاپ بی بی کا مقبرہ تھا۔ اورنگ زیب کی ملکہ کی یادگار۔ پہلی نظر میں اس عمارت کو دیکھ کر خیال آیا۔ اورنگ زیب کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس نے تاج محل کی پیروڈی تیار کروا کر اپنا مذاق اڑوایا ہے۔ بی بی کے مقبرے کو دیکھو تو یوں لگتا ہے کہ جیسے تاج محل سکڑ گیا ہو۔ فاقے سے اس کی ہڈیاں پسلیاں نکل آئی ہوں۔ اسے کوئی مرض لاحق ہو گیا ہو۔ شاید مجھے یہ سب اس لئے لگ رہا تھا کہ میں نے پہلے تاج محل دیکھ لیا تھا۔ ہو سکتا ہے ہندوستان کے محکمہ سیاحت نے یہ ترکیب بنائی ہو کہ سیاح نقل کو دیکھ کر جب اصلی تاج محل کو دیکھیں گے تو اس سے زیادہ متاثر ہوں گے۔ کیوں کہ بیرون ملک اور خصوصاً" مغرب اور جنوب مشرقی ممالک سے آنے والے سیاحوں کی پہلی منزل عموماً" بمبئی ہوتی ہے۔ وہ اورنگ آباد سے ہوتے ہوئے راجستھان، دہلی اور پھر آگرہ جاتے ہیں۔

اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے آخری ایام اورنگ آباد میں گزارے۔ وہ تہی دست تھا۔ اور ٹوپیاں سی کر گزر اوقات کرتا تھا۔ اس کی وصیت تھی کہ

allurdupdfnovels.blogspot.com

میری قبر کو کچا ہی رہنے دیا جائے اور تدفین کے اخراجات اس پونجی سے پورے کئے جائیں جو ٹوپیوں کی سلائی سے میسر آئی تھی۔ دنیا کے ہر زمانے' ہر دور کے بادشاہوں کے مقبروں کے مقابلے میں ہندوستان کے بادشاہ کا عظیم ترین مقبرہ۔

خلد آباد میں اورنگ زیب کی کچی قبر پر پانی کے چھڑکاؤ سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ کر اگربتی کی لپٹوں سے جھوم جھوم کر مل رہی تھی۔ میرے گورے ساتھی سیاحوں کو ہندوستان کی تاریخ کے اس پہلو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ گلی کے کنارے واقع چائے خانے کی لکڑی کے بنچوں اور میز پر بیٹھے میلی میلی پیالیوں میں چائے پی رہے تھے۔ یہ لوگ' بھورے اور کالے لوگوں کے ملکوں میں سیاحت کے شوقین' جونہی موقع ملتا ہے ایک ہی نسل کے پرندوں کے غول کی طرح اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ صبح سے شام تک کے مشاہدات اور تجربات پر بات چیت کرتے ہوئے وہ ایک دم بہت سارے لگ رہے تھے۔

سفر کے دوران اگر کوئی کسی طور ماحول کی اجنبیت کو توڑ دے تو وہ ایک دم اپنا اپنا سا لگنے لگتا ہے۔ خصوصاً" جب وہ ایسی زبان بول رہا ہو جو آپ کی سمجھ میں آ رہی ہو اور آپ کی بات اسے سمجھائی جا سکتی ہو۔ جیسے چند برس قبل روم میں دو دن تک کوئی ایسا شخص نہ ملا تھا جسے کوئی بین الاقوامی زبان آتی ہو۔ سوائے پون سیون کی مالکہ کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے۔ مگر میڈ واسٹیشن سے باہر ملنے والے امریکی جوڑے سے چند لمحوں کے لئے گفتگو کی تو جی چاہا تھا کہ کاش انہیں جلدی نہ ہوتی وہ کچھ دیر تک اور باتیں کر لیتے۔

اجنتا جانے والی بس میرے ہوٹل پر آئی تو کل والے ساتھیوں میں سے تین ہی بچے تھے باقی لوگ اپنی اگلی منزلوں کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ حالانکہ ایلورا اور اجنتا دونوں کو ایک ہی دن میں دیکھ لینا ممکن نہیں ہے اس لئے اورنگ آباد میں دو دن کا قیام لازمی ہے۔ اجنتا تک کا سفر دو گھنٹے کا تھا۔ شیرن پہلے سے موجود تھی۔ اور نیوزی لینڈ سے آیا ہوا ایک جوڑا بھی۔ عورت آج بھی اگلی سیٹ پر بیٹھی سڈنی شیلڈن کا ناول اف ٹومورو کمز پڑھ رہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان یہی قدر مشترک تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر کہا۔

"لک"۔ میں جب سیاحت کے لئے نکلی تھی تو گھر سے شیلڈن کا ہی ناول ساتھ لیتی آئی تھی۔ امریکی بیسٹ سیلرز پیپر بیک۔ ان کی یہی خوبی ہے انہیں آپ کہیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ گھر میں' سفر میں' موڈ بنا کر' بنا موڈ کے مجھے شیرن سے گپ لگانے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ اور بہت سے ہمعصروں کی طرح۔ کچھ سے بہتر تھی۔ اس لئے کہ وہ کھلے ذہن کی' سوجھ بوجھ والی لڑکی تھی۔ نہ جانے کیا سوچتے ہوئے بولی۔ میں نے سفر کے دوران بہت لوگوں کو اپنے ایڈریس دے دیئے ہیں۔ خدا

allurdupdfnovels.blogspot.com

کرے وہ مجھے خط نہ لکھیں۔"

مگر شیرین نے اگلے لمحے میری ڈائری میں اپنا پتہ لکھتے ہوئے کہا کہ تم اسی طرح گھومتی پھرتی کبھی امریکہ آؤ تو میرے پاس شیٹل ضرور آنا۔ مجھے بھی معلوم تھا اور شاید اسے بھی کہ اجنتا سے واپسی کے بعد یہ لمحاتی یگانگت کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے گی۔

بمبئی میں اپنے دفتر میں بیٹھے آرکیٹیکٹ بجیٰ مرچنٹ مجھے سمجھا رہے تھے کہ خبتا کا مطلب ہے لوگ' آبادی اور اجنتا سے مراد ہے آباؤ اور بیابان جگہ۔

اجنتا کے غار میں ایک ہزار سال تک جنتا کی آنکھوں سے اوجھل رہے۔ ان کا محل وقوع ہی کچھ ایسا ہے۔ کہ وہ بازیاب ہونے کے باوجود اپنے گرد و پیش کی وادی میں چٹانوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان تک پہنچنے کے لئے پہلے بے باخبر رہنے اور راہنمائی کی ضرورت ہے۔

اجنتا کی دریافت کے بارے میں دو کہانیاں مشہور ہیں۔ محققین میں سے ایک کا کہنا ہے کہ اسے برطانوی سپاہیوں نے 1819ء میں ڈھونڈ نکالا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ 1817ء میں چند شکاری چیتے اور شیر کے شکار میں سرگرداں تھے کہ ایک جنگلی لڑکا انہیں انجانے میں اس طرف لے آیا اس طرح ہندوستانی ثقافت کا انمول خزینہ دریافت ہوا۔

دو گھنٹے کے سفر میں بڑی ویران سی جگہیں نظر آتی رہیں۔ کہیں خاردار جھاڑیاں سرخی مائل زمین ریتلے ٹیلے کبھی کبھار کچھ کھیت کھلیان نظر آجاتے۔ مگر ویرانی سی تھی کہ یکایک کچھ رونق نظر آئی۔ زندگی جاگی ہوئی۔ ریڑھیاں' خوانچے' کھوکھے' جیسے ہمارے ہاں مزاروں کے سامنے بڑی پراسرار سی معروفیت نظر آتی ہے۔ سوغاتیں خریدنے والوں کی تبرک بیچنے والوں کی ہم لوگ اجنتا کے ویو پوائنٹ پر پہنچ گئے تھے۔

بدھ پرستوں نے جو کچھ کیا۔ ان بیابان غاروں کی پراسراریت میں اپنے عقیدے اپنی لگن' اپنی تپسیا سے جس طرح کا ڈھا تراشا سنوارا ہم سے سینکڑوں برس پہلے وہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلا کمال تو فطرت نے کیا۔ جو اس جگہ کو دریا کے

کنارے' گھوڑے کی نعل کی صورت میں بے شمار غاروں کی قطار لگا دی۔ ہنری مور کہتا ہے "پہاڑی سلسلوں اور چٹانوں میں موجود سرنگیں تجسس ابھارتی ہیں۔ وہ بہت پراسرا معلوم ہوتی ہیں۔ وہ انسانی حسیات پر اس انداز سے اثر انداز ہوتی ہیں کہ کھوج لگانے کی امنگ پیدا ہونے لگتی ہے۔"

ویو پوائنٹ سے غاروں تک کی رسائی' کھردری ناہموار بل کھاتی ہوئی سیڑھیاں۔

مایا نے خواب دیکھا تھا کہ ایک سفید ہاتھی اس کے اندر آگیا ہے۔ اس نے اپنے پتی کو اس عجیب و غریب خواب کے بارے میں بتایا۔ پنڈتوں اور برہمنوں کو خواب کی تعبیر بتانے کے لئے بلایا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ مایا کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ اگر بادشاہ رہا تو بہت بڑا حکمران ہوگا اگر اس نے راج پاٹ تیاگ دیا تو وہ نہایت عظیم شخص بن جائے گا۔

ایک جاتک کہانی۔

اجنتا کے بدھ استواؤں کی کہانیاں' گوتم بدھ کی زندگی کی کہانیاں' غاروں کی دیواروں پر' چھتوں پر' بدھ کے پتھر میں تراشے ہوئے مجسمے' دیواروں پر۔ دروازوں پر۔

یہ سنگتراش' مجسمہ ساز' چتر کار' کون تھے۔!!

کیا تصویر کے نیچے کسی کا نام لکھا ہوا نہیں ہے۔ وہ کوئی نہیں تھے۔ انہوں نے یہ فن کہاں سے سیکھا تھا۔ کہیں سے نہیں۔ تصویر کا یہ ضابطہ' تقسیم' توازن' وہ محض قیاس تھا۔ خود ساختہ تھا۔ وجدانی تھا۔ وہ علم ہندسے کے علم سے ناواقف تھے۔ اس لئے ان کے ہاں اقلیدی رکھ رکھاؤ نہیں بلکہ عضوی ہے۔ اور گینک ہے۔

دور بیابان کے غاروں کی گمبھیر تنہائی میں بسنے والا مصور یا سنگتراش انسان بھی تو تھا۔ خواہش' مراد' آرزومندی کبھی اس کی نفس کشی کمزور بھی پڑتی ہوگی۔ پھر وہ ایسی عورت کے بارے میں سوچتا ہوگا۔ جس کے گول گول ابھرے ہوئے سینے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں جھیل جیسی گہرائی ہو۔ پھر وہ اس کے بالوں میں موتیوں

allurdupdfnovels.blogspot.com

کی لڑیاں سجاتا ہے۔ اسے مالا پہناتا تھا۔

نہیں اسے جاتک مالا بنانی ہے۔ وہ اس کام کے لئے متعین ہوگیا ہے۔

اس طرح اجنتا کا فن معروضی عناصر اور روایت کے بیان کا امتزاج ہے۔ رومیلا تھاپر نے ہندوستان کی تاریخ لکھتے ہوئے مورخ ولسٹن اسمتھ کی اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ ممکن ہے اجنتا کتب فکر کا تصویری فن ہی ایران اور یونان کے فنون لطیفہ سے متاثر ہو۔ اس پر ہندوستان کے مورخوں نے بہت واویلا مچایا کہ نہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستان کا قدیم فن مصوری یونانی فن مصوری سے کہیں بہتر ہے۔

اجنتا کے غار سب کی سب مغرب کے رخ پر کھلتے ہیں۔ وہاں برقی روشنی کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے نہ ہی فلیش گن استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ اتفاق سے میرے کیمرے میں 400 اے ایس آئی کی فلم تھی۔ جس سے نیم تاریک غاروں میں بھی تصویری کشی ممکن ہو سکی۔

"یہ تمام تصویریں جو اپ کو دیواروں اور چھتوں پر نظر آرہی ہیں ٹیمپرا تکنیک سے بنائی گئی ہیں۔" گائیڈ نے ہماری راہنمائی کی۔

ٹیمپرا تکنیک۔ یہ اصطلاح تو بہت بعد میں اس فن کے ساتھ منسوب کی گئی ہوگی۔ ورنہ بدھ مت کی زندگی کے واقعات کو سلسلے وار بیان کرنے والے ان مصوروں کے پاس آئل، واٹر، کریان ایکرسلک قسم کا کوئی رنگ نہ تھا۔ اس کے رنگ لالٹین کی کالک، پسی ہوئی مٹی، پسا ہوا چونا، گائے کا گوبر اور نباتات کے رنگ تھے۔ اس کے پاس کچھ بھی ریڈی میڈ نہیں تھا۔ مگر اس نے جو فن تخلیق کیا وہ آئندہ کئی صدیوں کے دوران تخلیق کئے گئے فن مصوری کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا۔

"ہاں درست ہے۔" میں نے اجنتا کی ایک فریسکو کو دیکھ کر سوچا۔ چتائی بہت انٹرورٹ تھا۔ وہاں جو کچھ تھا اس کا اپنا احساس اور تصور تھا۔ وہاں کسی بیرونی اثر کا دخل ممکن نہیں تھا۔ اب خدا جانے چتائی نے اجنتا فن مصوری کا مطالعہ یا مشاہدہ کیا یا نہیں مگر نیم وا غزالی آنکھیں۔ مخروطی انگلیاں۔ نسائی چہروں

پر اندی ہوئی دلربائی۔ فن چتائی کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اجنتا کا مصور بھی انٹرورٹ تھا۔ وہ غاروں کی ویران تنہائی میں عورت کا محض تصور کر سکتا تھا۔ مگر وہ قدرے بے باک تھا۔ چتائی اپنے نسائی پیکر کو آنچل اوڑھاتا ہے۔ جب کہ اجنتا کے مصور نے سینوں کی گولائی اور کولہوں کے خم بڑے انہماک سے بنائے ہیں۔ چتائی نے اپنی ثقافت و تہذیب کے تقاضے پورے کرتے ہوئے عورت کو لباس پہنایا۔ اجنتا کی عورت اپنی زیبائش کے لئے چوڑیاں، کڑے، بندے، مالا، پہنتی ہے مگر اپنا آپ لباس میں نہیں چھپاتی۔ وہاں کوئی منافقت نہیں ہے۔

اجنتا میں 30 غار ہیں۔ ان سب کو دیکھنا ممکن نہ تھا۔ غار نمبر دس۔ بدھ کا اوتار ہاتھی۔ بہت سارے ہاتھی۔ گھنے جنگل میں۔ قدرتی نباتات کے درمیان۔ قدیم ہندوستانی فن مصوری میں لینڈ اسکیپ نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ کسی کتھا، کسی دیو مالا، یا جاتک مالا کے بیان کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ وہ بطور علامت سامنے آیا۔ ورنہ اسے فطری مناظر سے کوئی رومانوی وابستگی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس خطے میں فطرت نے انسان کے ساتھ زیادہ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ تیز دھوپ، طوفانی بارشیں، آندھیاں، زندگی کے لئے خطرات ہیں، ان سے محبت نہیں کی جا سکتی تھی۔ خصوصاً" اس وقت تک جب تک صنعت اور ٹیکنالوجی کی بدولت فطرت کی سفاک قوتوں کو تسخیر کرنے کی تدبیر نہیں کرلی گئی۔

"میں آپ کے ساتھ میز پر بیٹھ جاؤں" اجنتا میں غار گردی کے بعد اورنگ آباد لوٹنے سے قبل ریسٹوران میں کھانے کے دوران مجھے تنہا بیٹھی کو دیکھ کر ایک شخص میرے پاس آکر بولا۔

"جی پلیز۔۔" یہ ہمارے گروپ کا آج کا گائیڈ تھا جو صبح سے ہمارے ساتھ تھا۔ مگر زیادہ تر سیاح اس کی بات سننے کے بجائے اپنے مشاہدے پر اکتفا کر رہے تھے۔

"کیا آپ پاکستان سے آئی ہیں۔" اورنگ آباد میں ایک بار اور وہی سوال، اپنے یقین کو مضبوط بنانے کے لئے۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

جی۔۔۔ کراچی سے آپ۔۔

اورنگ آباد کا رہنے والا مسلمان۔ اردو شعبہ و ادب میں دلچسپی رکھنے والا۔ کسی ادبی تنظیم کا سربراہ خود کو ترقی پسند بتا رہا تھا۔ کئی نام گنوائے اورنگ آباد میں منعقد کئے گئے اردو مشاعروں کا ذکر۔

مجھے اس وقت پروا نہیں تھی کہ میری امریکی ساتھی شیرن کہاں گئی۔ ارے اس نے کھانا کھایا یا نہیں۔ نیوزی لینڈ کی عورت نے اپنا ناول کتنا ختم کرلیا۔ وہ شخص جو میرے قریب آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ میرے لہجے میں بات کررہا تھا۔ وہ خیال کو کھیال نہیں کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی باتیں اچھی لگیں۔ وہ اصرار کررہا تھا کہ وہ میرے کھانے کا بل ادا کرے گا میں نے اسے منع کیا۔ لیکن۔ وہ مسلمانوں کے شیوہ میزبانی کا سکہ جمانا چاہتا تھا۔ چلو ٹھیک ہے۔

آپ کب تک اورنگ آباد میں ہیں۔

آج ہی شام مجھے رات آٹھ بجے بمبئی روانہ ہونے والی کوچ سے چلے جانا ہے۔

نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ آج نہ جائیں۔ میں کل آپ کو یہاں کے ادبی حلقوں کے ارکان سے ملوانا چاہتا ہوں۔ پھر نہ جانے کب موقع آئے آپ آج شام نہ جائیں۔

نہیں مجبوری ہے۔ کیوں کہ مجھے دو روز بعد بہرحال کراچی پہنچنا ہے۔

کھانے کے بعد بس اورنگ آباد روانہ ہوچکی تھی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرے ٹرپ کے بارے میں پاکستانی سیاست کے بارے میں بہت سی باتیں۔

آپ لوگ اپنی لڑکیوں کو کیوں نہیں پڑھاتے؟

نہیں ایسا تو نہیں ہے۔

میری بہنیں پڑھی لکھی ہیں۔

کیا آپ کی بہنیں یونیورسٹی میں پڑھی ہیں۔

نہیں، ایسا نہیں ہوسکا۔ انہیں یونیورسٹی میں پڑھانا مشکل تھا۔ کیوں۔ بہت سی باتیں ہیں۔ اچھا آپ رک رہیں ہیں کیا۔ نہیں۔ مشکل ہے۔ میں شام کو آپ

کے ہوٹل پر آؤں گا۔ سنیں کیا آپ شراب پیتی ہیں۔

ترقی پسند، روشن خیال اورنگ آباد کا مسلمان نوجوان مشاعرے، ادبی حلقے، نہیں ہماری لڑکیاں یونیورسٹی میں نہیں پڑھ سکتیں۔ کیا آپ شراب۔۔۔!!

وہ جو خود کو روشن خیال بتا رہا تھا۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

نریمان پوائنٹ بمبئی۔

یہ ایک خوشگوار شام تھی۔ ہندوستان میں میرے سفر کی آخری شام اور میرے کیمرے میں فلم کے کچھ شاٹس باقی بچے تھے۔ میں کیمرے سے ساحل سمندر پر گولہ باری کرنے کے ارادے سے یہاں آگئی تھی۔

اورنگ آباد سے بمبئی تک کا۔ رات بھر کا سفر' چاندنی رات میں سوتے جاگتے بیت جانے والا سفر۔ کوچ میں آکر سیٹ سنبھالی تو ایک نو عمر لڑکی میرے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ مخاطب ہوئی۔ "میرا نام ٹینا ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔"

"آپ"

ارے آپ پاکستان سے آئی ہیں۔ جب آپ کو میں نے دیکھا تو پہلی نظر میں آپ مجھے نارتھ کی لگی تھیں۔ ہندوستان کا مخصوص انداز۔۔۔ نارتھ کے مراد دہلی' چندی گڑھ' امرتسر' ساؤتھ بنگلور' مدراس وغیرہ۔

وہ باتوں ہی باتوں میں بے تکلف ہوگئی۔ اس کے انداز میں خوبصورت اپنائیت تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بولی مجھے اگر پتہ چلتا کہ آپ ہوٹل میں ٹھہری ہیں تو میں آپ کو اپنے گھر لے جاتی۔ ہماری برابر والی سیٹ پر بیٹھا ایک لڑکا بڑی دیر سے صبر کئے بیٹھا تھا۔ بالآخر بولا "آپ لوگ باتوں میں اس قدر مصروف ہیں کہ میں یہاں اکیلا بیٹھا بور ہو رہا ہوں۔"

"او ہو۔ تو آپ جیلس ہو رہے ہیں۔" کوچ میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ میں سوچنے لگی کہ اس طرح کے اتنے بے تکلف خوشگوار ہم سفر بھلا مجھے اس سے پہلے کیوں نہ ملے۔ میں دہلی جانے سے پہلے وائی ڈبلیو سی اے کے ہوسٹل میں کمرے کی بکنگ کروا کر گئی تھی۔ کیوں کہ میں واپسی پر ایک بار پھر بمبئی کے ہوٹلوں میں ایک

کمرے کی خاطر سرگرداں نہیں ہونا چاہتی تھی۔

نریمان پوائنٹ پر بہت چہل پہل تھی۔ لکڑی کے بنچوں پر بیٹھی گپ لگاتی۔ چپس کھاتی' قہقہے لگاتی لڑکیاں' آزادی کا احساس لئے۔ ماحول کی کشادگی میں نظر آنے والے اجلے اجلے چہرے۔ میں نے اس شام کو لوٹنے کا اس لئے بھی سوچا تھا کہ واپس لوٹوں گی تو مجھے اپنے ہاں کی عورت کو رسی سے باندھ کر پیچھے کی طرف کھینچنے والی خبریں سنائی دیں۔ میں گزشتہ چھ ہفتے سے ہندوستان کے شہر شہر گھومی تھی۔ میں نے اپنے تن من کا حبس کو دور کیا تھا لیکن میں واپس جاؤں گی تو کچھ بھی تو نہیں بدلا ہوگا۔ وہاں تو گھر سے دفتر اکیلے جانا محال ہو رہا تھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے میں نے آج کیا۔ اور اس سے پہلے جب میں بمبئی میں چند روز رکی تھی تو ہر شام کبھی نریمان پوائنٹ اور میرین ڈرائیو اور کبھی گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے ٹہلتے ہوئے بڑی بے فکری کے ساتھ۔ اپنی دھن میں ڈوب کر گزری تھی۔

کل رات کوچ جب تقریباً" دو بجے احمد نگر پہنچی تو ٹینا کو بھوک لگی تھی۔ سامنے ایک ریسٹوران تھا کوچ کے ڈرائیور نے اعلان کیا تھا کہ کوچ پندرہ بیس منٹ رکے گی۔ ہم دونوں ڈگر ڈگر ریسٹوران میں داخل ہوئیں تو ایک سکھ ریسپشنسٹ میں اونگھتا ہوا موجود تھا۔ اسے سینڈوچ اور ڈرنکس کا آرڈر دیا۔ اسے کہا کہ وہ بوتل میں اندر موجود سیال کے ساتھ بوتل کی قیمت بھی لے لے تاکہ ہم اسے اپنے ہمراہ لے جاسکیں اور جب ڈرنک ختم ہو جائے تو اسے راستے میں کوچ سے باہر پھینک دیں۔

میرین ڈرائیور پر ٹھنڈا ٹھنڈا ناریل بک رہا تھا۔ بمبئی کی ایک دم خالص مشروب' میں ناریل کے اسٹرا کو منہ میں ڈالے سوچ رہی تھی۔

ٹینا ہندوستان کی نوجوان نسل کی نمائندہ تھی۔ صاف گو۔ بے باک۔ میں نے راجستھان کے سفر کا ذکر کیا تھا اسے وہاں کے ایک راجکمار کا خیال آیا۔ وہ اس کا دوست تھا۔ جس نے ایک روز اپنی تمام گرل فرینڈز کی بیسیوں تصویریں میز پر تاش کے پتوں کی طرح پھیلا دی تھیں۔ دیکھو۔ اس میں دنیا بھر کے ملکوں کی لڑکیاں ہیں۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

سورج آہستہ آہستہ چوپاٹی کے اس پار پہاڑیوں کے پیچھے چھپتا جا رہا تھا آسمان سے لیکر سمندر تک سنہری' نارنجی' نارنجی' فاختائی' سرخ پتھر پر پھیلتے گئے۔

کل رات کوچ پونہ پہنچی تو ٹینا کو اپنا دوست یاد آنے لگا۔ شہر سویا ہوا تھا۔ لیکن بہت ساری دودھیا روشنیاں جاگ رہی تھیں۔ ٹینا مزے لے کر بتا رہی تھی۔ میرے دوست آنند کی جب یہاں پوسٹنگ تھی تو بڑا مزہ آتا تھا۔ میں اورنگ آباد سے بمبئی جاتے ہوئے اسے اطلاع کر دیتی _ وہ رات کو کوچ اسٹیشن پر موجود ہوتا اور پھر وہ ضد کر کے اپنے ساتھ لے جاتا کہ تم اگلی کوچ سے بمبئی چلی جانا۔ میں اسے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہر بات کھری کھری بتا رہی تھی۔ بھرپور زندگی کی لذتوں سے آشنائی۔ کوئی ان ہبشن نہیں۔ اپنے ہر فعل کی ذمہ داری اپنے پر۔

میرن ڈرائیور پر سورج غروب ہو گیا تھا۔ جیسے آسمان پر گرے رنگ کی چادر بچھتی جا رہی ہو۔ ایک شخص جو اپنے پوڈل کی زنجیر تھامے کچھ دیر پہلے میرے قریب سے گزرا تھا سڑک پار کر کے اپنے فلیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ سمندر کے کنارے برقی روشنیاں جگمگانے لگی تھی۔ جھٹ پٹے کا سماں۔ گہری تاریکی چھانے سے پہلے کا سماں۔ فطرت اور انسان دونوں کو ہی جلدی ہوتی ہے۔ فطرت کو آفتابی روشنی گل کرنے کی' انسان کو برقی روشنی جلانے کی۔ دونوں مل کر دلفریب منظر پیش کرتی ہیں۔

میں نے ایک پرائے ملک کی پرائی شام کو جی بھر کر لوٹا تھا۔ آج صبح سحر پھوٹنے لگی تھی۔ پوری رات کا چاند ماند پڑنے لگا تھا تو کوچ کی رفتار میں پریشان کن سی ناہمواری آ گئی تھی۔ ٹینا جو کچھ دیر پہلے خراٹے لے رہی تھی ایک دم جاگ گئی۔ میرے چہرے پر فکر مندی اور تجسس دیکھ کر بولی _ "گھاٹیاں شروع ہو گئی ہیں۔" اوہ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیوں کہ مجھے خیال ہونے لگا تھا کہ کوچ کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ سطح زمین کی ناہمواری کو کوچ نے بڑے استقلال کے ساتھ برداشت کیا تھا۔

میرن ڈرائیو کی دیوار پر اتنی آبادی براجمان تھا کہ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے سڑک سے کوئی جلوس یا کسی بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے۔ دراصل یہ قرب

وجوار کے فلیٹوں کے مکین تھے یا وہ جو ہوٹلوں میں مقیم تھے۔ یہ ان کا روز مرہ کا معمول ہے۔ بند کمروں سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینے کا معمول۔ دفتروں دوکانوں سے لوٹتے ہوئے کچھ دیر کو ستانے کا معمول۔

کلک۔ میرے کیمرے کی آخری تصویر بن چکی تھی۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

بمبئی ایئرپورٹ۔

کل بمبئی پہنچتے ہی پتہ چلا کہ اگلے روز پورے ہندوستان میں بند ہے۔ انگریزی اخباروں نے اس لفظ کو اسی طرح لکھا تھا۔ پہلے تو سمجھ میں نہ آیا۔ ہر ملک کے ابلاغ کے اپنے اپنے طریقے' اپنی اپنی اصطلاحات' دراصل بند سے مراد پہیہ جام ہڑتال تھی۔ مجھے بمبئی میں کوئی کام نہ تھا۔ سوائے اس کے مجھے تھوڑی بہت خریداری کرنی تھی تاکہ جو پیسے بچ گئے ہیں انہیں یہیں خرچ کردیا جائے بھاگم بھاگ بازار گئی۔ مجھے اپنے کولیگ کی بیوی کے لئے سوتی ساڑھی لینی تھی اور اپنے لئے کچھ کیسٹیں۔

کیسٹیں کی ایک چھوٹی سی دوکان۔ بلکہ کھوکھا۔ دوکاندار نابینا تھا۔ اس کی مدد ایک سانولی سلونی' سوتی ساڑھی پہنے عورت کررہی تھی۔ ایسی عورت جس کا شوہر یا تو کسی دفتر میں کلرک ہوگا یا کسی سکول کا ماسٹر وہ کسی پٹھاڑے دار کی بیوی اس لئے نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ پڑھی لکھی تھی۔ اسے کلاسکی موسیقی کی سوجھ بوجھ بھی تھی۔ لیکن نابینا دوکاندار اس سے زیادہ ہوشیار اور باخبر تھا۔

ان دونوں کو بھی اگلے روز بند کی وجہ سے گھر جانے کی جلدی تھی تاکہ راستے سے کل کے لئے کھانے پینے کی چیزیں خرید سکیں۔

صبح اٹھی تو ہوسٹل میں مقیم کئی مسافر جن کی روانگی آج ہی تھی پریشان تھے۔ بالآخر ہوسٹل والوں نے راہنمائی کی کہ ایئرپورٹ کے لئے ہوٹل تاج محل سے ٹرانسپورٹ روانہ ہوگی۔ ہوسٹل سے تاج محل ہوٹل تک کار راستہ پیدل کا تھا۔ سکھ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا کہ اگر میں ایک اور سواری کو ساتھ بٹھالوں تو وہ مجھے سو روپے میں ایئرپورٹ میں پہنچادے گا۔ میرا خیال تھا کہ ایسے موقع پر اس

سے اچھا سودا ممکن نہیں تھا۔

لیکن وہ موٹا۔ انگریز ٹورسٹ۔ مجھ سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ میں ہوسٹل سے روانہ ہوئی تو وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ بتایا کہ اسے آج شام برٹش ایئرویز سے لندن روانہ ہونا ہے۔

"تم کہاں جارہی ہو۔"

ایئرپورٹ کے لئے ٹیکسی لینے۔

احمق ہو۔ ٹیکسی کی کیا ضرورت۔ میں تو پیدل زیمان پوائنٹ جارہا ہوں۔ وہاں سے ایئرپورٹ کے لئے بسیں چلیں گی۔

"مگر میرے پاس سامان زیادہ ہے۔" وہ اپنا رک سیک کمر پر باندھے زیمان پوائنٹ کی طرف مڑگیا۔ پنجابی ہوتا تو کہتا۔ "چوپو"۔۔۔ اور بڑے بڑے سوٹ کیس لے کر سیاحت کرو۔ پھر ایسے ہی ہوتا ہے وہ اب ایئرپورٹ ریسٹوران کی ایک میز پر بیٹھا بیئر پیتے ہوئے تاش کے پتوں سے پیشنس کھیل رہا تھا۔

میرا مسئلہ تھا کہ ایئرپورٹ پر سات گھنٹے کیسے گزاروں۔ ریسٹوران میں اخبارات کے اسٹانڈ پر آتے جاتے مسافروں کی شکلیں دیکھتے بمبئی ایئرپورٹ ریلوے اسٹیشنوں جیسی بن گئی تھی۔ سارا شہر خالی پڑا تھا۔ سوائے اکا دکا پولیس کی گاڑیوں کے سڑکوں پر کوئی ٹرانسپورٹ نہ تھی۔ ہاں گلی کوچوں میں بچے کرکٹ کھیلنے کو نکل آئے تھے۔

ریسٹوران کی ایک میز پر ایک امریکی بڑے انہماک سے کچھ لکھ رہا تھا۔ امریکی' یورپی' روسی' ہندوستان ان ممالک کے فنکاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ برسوں سے صدیوں سے اس نے اوپر دیکھا۔ ہلکا سا مسکرایا یہ سوچ کر کہ اس ریسٹوران میں صرف وہی نوٹس نہیں لکھ رہا تھا۔

"کیا آپ بھی پاکستان جارہے ہیں۔"

میں نے یہ سوال ایک لڑکی اور لڑکے سے کیا تھا۔ مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ دونوں بہن بھائی تھے۔ میں نے یہ سوال اس لئے بھی کیا تھا کہ دونوں نے بڑے مہنگے کپڑے پہن رکھے۔ لڑکی کے کپڑے ریشمی تھے۔ اس کے

allurdupdfnovels.blogspot.com

ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔ لڑکے کا جیکٹ بڑھیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ ہم لوگ دوبئی جا رہے ہیں۔" ان دونوں کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا۔ وہ مسلمان تھے۔ لڑکے نے کان کے ساتھ ٹرانسسٹر لگا رکھا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا فائنل کھیلا جا رہا تھا۔ لڑکے نے کان سے ٹرانسسٹر ہٹا کر کہا۔ "پاکستان جیت گیا۔"

مجھے ایئر پورٹ کے ضابطوں کا خیال آیا کہ مجھے کہیں سے واہ کا شور سنائی نہ دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان دونوں کو کیا کہوں۔ یہ لوگ ہندوستان کے مسلمان۔ پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ ان پر یہی تو الزام ہے کہ رہتے ہندوستان میں ہیں مگر ان کا دل پاکستان میں اٹکا ہوا ہے۔ لیکن اس وقت ان دونوں کے چہرے ہر طرح کے تاثر سے خالی تھے۔

یہ باپ بیٹے۔ باپ نوجوان نہ تھا۔ بچے کی عمر آٹھ دس سال کی ہوگی۔ دونوں ایک میز پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ باپ نے اپنے لئے اسٹیک منگوایا اور بچے کے لئے سوپ اور برگر۔ بیٹا خاموشی سے اپنا کھانا کھا رہا تھا۔

بچے کی ماں۔ کہاں ہے وہ ساتھ کیوں نہیں ہے۔ میرے ذہن میں خوامخواہ ایک سوال اٹھ رہا تھا۔

بمبئی سے کراچی کی فلائیٹ۔

اس خیال سے کہ میں ایک دو گھنٹوں میں گھر پہنچ جاؤں گی دل اچھل رہا تھا۔ بلکہ جذباتیت کا یہ عالم کہ میں جاتے ہی اپنے گھر کو چوموں گی۔

خوب مزے کر لئے تھے۔ بے ٹھکانہ ہو کر۔ مگر واپسی کا سفر شروع ہوا تو ٹھکانے کی راحتیں اور تحفظ یاد آنے لگا۔ اورنگ آباد ہوٹل سے روانگی کے وقت جب اپنی چیزیں سمیٹیں تو خیال آیا تھا کہ سفر میں یہ خوب ہے کہ کسی منزل پر پہنچے۔ سامان کھولا۔ کپڑے لٹکائے۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر گھڑی اتار کر رکھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر ہینڈ لوشن' فاؤنڈیشن ہیئر برش رکھا۔ اگلے روز وہ تمام چیزیں اکٹھی کیں اور سوٹ کیس کی زپ چڑھا کر چل دیئے۔ اگلی منزل کو۔ وہاں کوئی وابستگی نہیں ہوتی۔

میرے سامنے اور پیچھے کی نشستوں پر ویسا ہی کراؤڈ تھا جو بمبئی آتے ہوئے

ملا تھا۔ کیمیوں کا کراؤڈ۔ مفت کے ٹکٹ پر بمبئی کی سیر کرنے والے لوگ۔ وہ لوگ فائف مفت کی بیئر پی رہے تھے۔

سفر کی ایک اور اچھی بات بھی ہے۔ آپ کو کسی بس یا ٹرین یا کسی جگہ کوئی ایسا شخص مل گیا جو آپ کو پسند نہیں آ رہا۔ یا کسی وجہ سے آپ کو اس پر غصہ آ رہا ہے تو وہ آپ کو دوبارہ نظر نہیں آئے گا۔ آپ اسے پھر سے دیکھنے پر مجبور نہیں ہیں۔ مثلاً "مدراس ایکسپریس کے روکھے اور کسیلے مسافر جے پور میں لڑکی کو بھگا کر لانے والا لڑکا' اجمیر بس اسٹیشن کا وہ بدتہذیب' کھردرا' بڑی بڑی مونچھوں والا شخص۔ وہ لوگ کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ دوبارہ۔

مجھے جگدیش اور پرکاش کا خیال آیا۔ پرکاش پورا دن میرے ساتھ جے پور میں تھا۔ صبح سے شام تک کے ٹور میں۔ ہم دونوں نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ بڑا مہذب اور شائستہ شخص تھا۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ پھر وہ جے پور کے باغ میں بیٹھا میرے ساتھ پاکستانی سیاست پر تبادلہ خیال کرتا رہا۔ جاتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے نمشکار کیا تھا۔ اور وہ جگدیش۔ کھلا تو بڑا گھٹیا لگا۔

میں اجنتا کی غاروں کے ٹور کے دوران غار نمبر 17 کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ نیچے کی طرف جھانکا' ایک سیاح کا کہنا تھا کہ مون سون کے بعد یہ علاقہ بڑا سرسبز ہو جاتا ہے۔ پھر غاروں کی پراسراریت اور رمزیت' فطرت کے روشن رنگوں کے ساتھ مل کر بڑا دلفریب منظر پیش کرتی ہے۔ یہ فروری کی ایک دوپہر تھی۔ مون سونی بارشوں سے یہاں جو سبزہ اگ آیا تھا' تند و تیز ہواؤں میں وہ پیلا پڑ گیا تھا۔ خیالا بھورا' اڑتی ہوئی سبز رنگت' میرے ذہن میں دو الفاظ کودے زرخیز پتھر۔ پتھر کی سختی نرم پڑ گئی تبھی تو اس کی زرخیزی سامنے آئی۔ لیکن یہ بھی کہ سنگتراش کے ہاتھوں میں اتنا زور تھا۔ اس کے جذبے میں اتنی گہرائی تھی کہ یہاں ہر دور کی کہانیاں پتھر میں لکھی ہیں۔ ہنری مور نے کہا تھا کہ "ہر خیال کا ایک مخصوص طبعی جسم ہوتا ہے۔"

کھجوراؤ میں شیو پرستوں کا خیال۔

شاہجہان کا خیال۔

allurdupdfnovels.blogspot.com

اورنگ زیب کا خیال۔

ایلورا اجنتا میں بودھوں کا خیال۔

کیلاش مندر کے فن کاروں کا خیال۔

رات کے سوا دس بجے تھے۔ جہاز سرکنے لگا تھا۔ میرا خیال اس عورت کی طرف جاتا تھا وہ جو اس بچے کی ماں تھی جو اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا سوپ پی رہا تھا۔

میں چیک ان کر کے ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھی تو ایک مرد کی آواز کان میں پڑی۔ تم یہاں سے چلی جاؤ پیشتر اس کے کہ میں بے قابو ہو جاؤں۔

عورت کہہ رہی تھی۔ تم ایسا نہ کرو۔ میرا بچہ مجھے واپس کردو۔ تم اسے نہ لے جاؤ۔

بچہ خاموش تھا۔ وہ ماں باپ دونوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔

میرے قدم ٹھٹک گئے۔ "کیا ہوا۔"

عورت کے لہجے میں لجاجت تھی مگر اس کی آنکھ میں کوئی آنسو نہیں تھا۔

"تم اسے نہ لے جاؤ۔۔۔۔"

یہی ہوا ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ یہ مرد جب بمبئی میں تھا تو ایک معمولی شخص تھا۔ وہ جوانی میں خوش شکل رہا ہوگا۔ مگر اسے اپنے ہاں کی روایتی، شرماتی لجاتی سر پر ساڑھی کا پلو اوڑھے لڑکیاں پسند نہ تھیں۔ یہ مل گئی۔ سانولی سلونی۔ مگر پڑھی لکھی ورکنگ وومن۔ اس نے اس کے ساتھ چکر چلا دیا۔ ممکن ہے شادی بھی کرلی ہو۔ مگر موقع ملتے ہی باہر چلا گیا۔ حوصلہ دیتا ہوا۔ میں جلد آجاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میرے بچے کا خیال رکھنا۔

وہ نہ آیا۔ بچہ بڑا ہوگیا۔ وہ خرچہ بھی نہیں بھیجتا تھا۔ عورت نے بمشکل اسے پالا پوسا پھر اس کے کسی ساتھی کو اس پر ترس آگیا۔ اس نے دست تعاون بڑھایا۔ عورت پہنچ گئی۔

مرد بیرون ملک کسی گوری کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ مگر اس کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اس کے بچے کی ماں کسی اور مرد میں دلچسپی لینے لگے۔

عورت کا حوصلہ پست ہوگیا تھا۔

عورت کی ممتا تڑپ رہی تھی۔

مرد ڈھٹائی دکھا رہا تھا۔ اپنا زور دکھا رہا تھا۔ وہ بچے کا بازو پکڑ کر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا عورت روئی نہ تھی وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی واپس جا رہی تھی۔

جہاز نے بمبئی کی سرزمین کو چھوڑ دیا تھا۔

"شکریہ" ایئر ہوسٹس نے مجھے نرم گرم اور نم آلود خوشبودار تولیہ تھمایا۔

اس راحت بخش خوشبو کا شکریہ۔